# BRITISH ORIENTALISTS AND THE HISTORY OF URDU LITERATURE

(Thesis submitted for the award of Ph.D. Degree)

**ALI JAVED**

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067

**MAY, 1982**

# برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو

## علی جاوید

ہندوستانی زبانوں کا مرکز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

Gram-JAYE

Telephone:

New Mehrauli R

NEW DELHI-110

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES.

12th May 1982

Certified that the material in this thesis on 'BRITISH ORIENTALISTS AND THE HISTORY OF URDU LITERATURE' submitted by Mr. Ali Javed has not been previously submitted for any other degree of this or any other University.

for Chairman,
Centre of Indian Langs.,
School of Languages,
JNU, New Delhi-67.

Mohd Hasan
(Mohammad Hasan)
Professor of Urdu
& Supervisor,
CIL,SL, JNU, New Delhi.

# فہرست


حرف چند — الف سے ج تک

پہلا باب : ادبی تاریخ نویسی اور اس کی روایت 1-28

دوسرا باب : برطانوی مستشرقین اور ان کی روایت 29-90

تیسرا باب : سر ولیم جونس، گل کرسٹ، گرئرسن اور گراہم بیلی کی ادبی خدمات :

سر ولیم جونس 91-102

گل کرسٹ 103-134

گرئرسن 135-161

گراہم بیلی 162-173

چوتھا باب : دیگر اہم مستشرقین :

گارساں دی تاسی 174-183

انا ماری شمل 184-188

رالف رسل 189-199

ڈیوڈ میتھیوز اور سی شیکل 200-212

پانچواں باب: بر طانوی مستند تر ین کی خدمات

کا تجزیہ 213 - 256

کتابیات 257 - 275

ضمیمہ 1 - 25

# حرفِ چند

برطانوی مستشرقین کی خدمات کے سلسلے میں اردو میں جو بھی کام ہوئے ہیں زیادہ تر ان کی بنیاد شخصیات پر رہی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں تاریخ ادب اردو کے بارے میں برطانوی مستشرقین کا رویہ اور ان کی خدمات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر چند غیر برطانوی مستشرقین کو بھی شامل کیا گیا ہے جو براہِ راست اس سلسلے کی ایک کڑی رہے ہیں۔

پہلے باب میں تاریخ ادب کے سلسلے میں مختلف علماء کے خیالات اور رویے کا ذکر اور ان کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں برطانوی مستشرقین کی روایت اور اردو ادب کی تعلیم و ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں سر ولیم جونس، گل کرسٹ، گریرسن اور گراہم بیلی کی ادبی

خدمات، اور چوتھے باب میں گارساں دتاسی، اینا ماری شمل، رالف رسل، ڈیوڈ میتھیوز اور سی۔ شیکل کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں برطانوی مستشرقین کی خدمات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتابیات کی فہرست کے بعد انڈیا آفس لائبریری، لندن میں موجود مستشرقین کی 'ہندوستانی' تخلیقات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

زیر نظر مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آئیں ان میں وسائل کی کمی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ استاد محترم پروفیسر محمد حسن کی کوششوں سے یورپ کے سفر پر جانے کا موقع ملا اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود مواد کی فراہمی ممکن ہو سکی لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے کئی اہم مقامات مثلاً اڈنبرا (کیمبرج، کاوٹن) اور دیگر کتب خانوں میں مطالعے کا

موقع نہ مل سکا۔

محدود ذرائع اور دیگر دشواریوں کے باوجود راقم الحروف کی کوشش، جو زیرِ نظر مقالے کی شکل پا سکی وہ استادِ محترم پروفیسر محمد حسن کی سرپرستی اور خلوص کا نتیجہ ہے جس کے لئے لفظ "شکریہ" ناکافی ہی نہیں بے معنی سا لگتا ہے۔ مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں ہمدردوں میں صرف تبسم کی ہمدردیاں شروع سے آخر تک ساتھ رہیں۔ پتہ نہیں اس خلوص کا حق کبھی ادا بھی کر سکوں گا یا نہیں!

(دستخط)

(علی جاوید)

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی۔

۱۱۰۰۶۷

۱۲ر مئی ۱۹۸۲ء

نئی دہلی

تاریخ کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ تصور پرست فلسفی اور مورخ ہیں جن کے نزدیک تاریخ بعض تصورات کی مجسم تعبیر کا نام ہے جو حقائق کی شکل میں مختلف ادوار میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ اسکا خوبصورت ترین اظہار کسی نے تاریخ کو زمین پر خدا کی جلوہ فرمائی (History is march of God on earth) سے کیا ہے۔ مختلف مفکرین نے جن میں ہیرو اور ہیرو ورشپ (Hero and Hero Worship) کا مصنف تھامس کارلائل بھی شامل ہے، تاریخ کو عظیم الشان آدرشوں کی تعبیر قرار دیا ہے اور اسی راستے سے تاریخ برگساں کے تخلیقی ارتقاء کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں مادیین (materialists) نے تاریخ کو سماجی تقاضوں کی تکمیل کا عمل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک افکار و خیالات دئے ہوئے سماجی حالات کا عکس ہوتے ہیں اور انھیں سماجی عوامل و محرکات کی بناء پر ظہور میں آتے ہیں۔ ان میں کارل مارکس اور دوسرے مفکرین بھی شامل ہیں جنھوں نے تاریخ کو مادی جدلیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اسی ضمن میں ٹوائن بی کے نظریے Challenge and Response کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو

تصور پرست ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کو قوموں کی عملی تکمیل کا حصہ سمجھتا ہے۔

ان نظریات سے قطع نظر تاریخ کے بارے میں بنیادی مسئلہ خود حقائق کی معروضیت کا ہے۔ تصور پرست فلسفیوں کے نزدیک حقائق کی حیثیت مکمل طور پر معروضی نہیں ہے بلکہ انکا رشتہ محسوس کرنے والے سے خاصہ گہرا ہے اور اس اعتبار سے حقائق کو بڑی حد تک اضافی کہا جا سکتا ہے ـــ دوسری طرف مادئین نے بھی حقائق کی توسیع و تفسیر کو اہمیت دی ہے اور انھیں مکمل طور پر مستقل بالذات اور غیر اضافی قرار نہیں دیا ـــ سوال یہ ہے کہ حقائق سے ہماری کیا مراد ہے اور کیا حقائق ہی تاریخ کا واحد موضوع ہیں ؟

حقائق کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخ کے جمع کئے ہوئے حقائق محض آثار قدیمہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ انکا رشتہ گزشتہ حقائق کے ماضی سے اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ ماضی کو حال کی روشنی میں دیکھنے سے یا حال کے حقائق کو ماضی کے حقائق کی مدد سے سمجھنا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ تاریخ ماضی کے حقائق

کی مدد سے حال کا مطالعہ کرنے کا ایک غیر معمولی طریقہ ہے۔ لے

اس اعتبار سے تاریخ جن حقائق کا ذکر کرتی ہے وہ مردہ حقائق نہیں ہوتے اور اس کے باوجود کہ وہ گزشتہ دور سے تعلق رکھنے والے حقائق ہوتے ہیں، ان کا تعلق گہرے طور پر عصر حاضر کے مسائل سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مورخ بیک وقت اپنے زمانے کو ماضی کے رشتوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اپنے ماضی کو حال کے رشتوں کی مدد سے بھی پہچاننے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر مورخ صرف حال کی تفہیم ہی نہیں کرتا بلکہ تشکیل بھی کرتا ہے اور برابر ماضی کی تاریخ سازی میں لگا رہتا ہے۔ اسی تراش خراش کی بناء پر مشہور روسی ہیئت پرست مفکر الشن بام نے تاریخ کو دوہری بصیرتوں کا علم (Science of double vision) قرار دیا ہے۔

حقائق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری معروضی اور مستقل بالذات (مثلاً یہ حقیقت کہ اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا بذات خود ظاہری معروضی اور مستقل بالذات ہے اور اس میں نہ کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہے، نہ توجیہہ کی

اور نہ کسی دوسرے حقائق کی) ـــــ دوسرے ایسے حقائق جنکا تعلق متعدد دوسری حقیقتوں سے ہوتا ہے۔ ان حقائق کی مختلف توجیہیں ہوسکتی ہیں اور ان کو دیکھنے کے مختلف زاویے ممکن ہیں۔ اس طرح تاریخ لازمی طور پر حقائق کے باہمی رشتوں کی داستان بن جاتی ہے اور ایک حقیقت کا تعلق دوسری حقیقتوں سے مختلف طریقوں پر دیکھا اور بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر مورخ کی ایک لازمی مجبوری یہ بھی ہے کہ وہ مختلف حقیقتوں کو کسی نہ کسی مربوط وحدت میں ڈھالنا چاہتا ہے اور انھیں کوئی نہ کوئی سمت یا شکل دینا چاہتا ہے۔ تاریخ مختلف اور انمل بے جوڑ حقیقتوں کی کھتونی نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر وہ ان حقیقتوں کو کسی ایک نظام میں مرتب کرنا چاہتی ہے اور تنوع و اختلاف کے درمیان ربط و آہنگ کی تلاش کرتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ تاریخ ماضی پر کسی نہ کسی ہیئت کے نفاذ کا نام ہے (imposition of form upon the past) ـــ اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو تاریخ ایک نئی معنویت کی جستجو معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ صرف حقائق کا یکجا کر دینا یا کچھ اور بھی؟ ظاہر ہے تاریخ حقائق کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تاریخی

حقائق یا ماضی کو ان کے مسائل کی روشنی میں حال کی نظروں سے دیکھنا۔ اور اس طرح ایک تاریخ نویس کا کام محض حقائق جمع کرنا نہیں بلکہ ان کا تجزیہ کرنا بھی ہے۔ ای ایچ۔ کار کے الفاظ میں:[۲]

کار کا یہ بھی کہنا ہے کہ تاریخ خالص طور پر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ اس لئے جب ہم تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہوں تو اس بات پر زیادہ دھیان دینا چاہئے کہ تاریخ لکھنے والا کون ہے۔[۳]

اس کے علاوہ جس دور کے لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جا رہا ہو، ان لوگوں کے بارے میں تاریخ نویس کی تخیلی سمجھ (Emaginative understanding) کا ہونا۔ اس سلسلہ میں وہ یہ بات صاف کر دیتا ہے کہ تخیلی سمجھ کو ہمدردی (Sympathy) سے خلط مبحث نہیں کرنا چاہئے۔[۴]

تیسرے یہ کہ ہم ماضی کا تجزیہ اور ماضی کی سمجھ صرف حال کی روشنی میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اسطرح ہم حال کی روشنی میں تاریخ بناتے ہیں جو ہمارے لئے بادشاہوں کی فتوحات کی کہانیاں نہیں بلکہ سماجی حقائق کی نشاندہی

کرتی ہیں۔

تاریخ کے سلسلہ میں مختلف رویوں میں ایک رویہ حقائق کے بیان کا رہا ہے اور ای۔ایچ۔کار انیسویں صدی کو "a great age for facts" کہتا ہے جس کی نمائندہ مثال گریجرنڈ (Gradgrind) کے یہاں تلاش کرتا ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے صرف اور صرف حقائق درکار ہیں کیونکہ زندگی میں صرف حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔" [5]

اس کے مقابلہ میں امریکی تاریخ نویس کارل بکر (Carl Becker) نے کہا کہ تاریخی حقائق وجود میں نہیں ہوتے جب تک کہ تاریخ نویس انھیں خود پیدا نہیں کرتا[6] لیکن تمام تاریخی خیالات کو کروچے نے بالکل نیا موڑ دیا۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی تاریخ عصری تاریخ ہوتی ہے اور اسی سے تاریخ کا یہ رویہ کہ ماضی کو حال کی روشنی میں دیکھا جائے مقبول ہوا۔[7]

یہ بات غور طلب ہے کہ تاریخ کو حال کی روشنی میں دیکھنا اور سماجی تجزیہ کرنا یا تاریخ کے ذریعہ سماجی حقائق تک پہنچنا اور حال کی گتھیوں کو ماضی کے سامنے رکھ کر دیکھنا اور سلجھانے کا نظریہ کارل مارکس کے ایک ہی جملہ سے

مل جاتا ہے جس نے آگے آنے والے تاریخ نویسوں کے لئے
نہ صرف نئی راہ ہموار کی بلکہ مشعل راہ کا کام کیا اور
وہ جملہ جس نے ساری دنیا کے دانشوروں کے نظریات میں
انقلاب پیدا کر دیا وہ یہ تھا کہ "آج تک کے تمام موجودہ
سماج کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ رہی ہے"۔ [۸]

تاریخ نویسی کا کوئی بھی نقطۂ نظر کیوں نہ
اپنایا جائے توجیہہ، تشریح اور تعبیر تاریخ کے لازمی
اجزاء بن کر سامنے آتے ہیں۔ حقائق کو پیش کرنے کے
لئے لازمی طور پر مورخ کو کسی نہ کسی نظریاتی بنیاد
کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور خواہ وہ کتنا ہی معروضی
یا سائنسی ہونے کی کوشش کیوں نہ کرے اسے حقائق
کی توجیہہ اور تشریح ہی میں نہیں بلکہ حقائق کے انتخاب
اور رد و قبول میں اور انکو کم یا زیادہ اہمیت دینے
کے سلسلہ میں بھی اپنی نظریاتی وابستگی سے متاثر
ہونا پڑتا ہے اور یہ نظریاتی وابستگی مختلف نوعیتوں کی
ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مورخ کی ذاتی پسند و ناپسند،
اسکا طبقاتی کردار، اسکا تاریخی نقطۂ نظر اور اسکی عصری شخصیت
سبھی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے تاریخ صرف

حقائق ہی کو نہیں، مورخ کی تاریخی اور تہذیبی شخصیت اور
اور نظریاتی موقف کا بھی اظہار ہے۔ اسی نقطۂ نظر
سے بعض مورخین اور فلسفیوں نے تاریخ کو مورخ
کا تجربہ قرار دیا ہے کیونکہ ایک طریقے پر وہ تاریخ
لکھتا ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ بناتا بھی ہے یعنی
(To write history is the only way of making it)
اسے آگے بڑھاتے ہوئے ای۔ ایچ۔ کار لکھتا ہے:

تاریخ میں مورخ کے علاوہ اسکی عصری بصیرت
اور نظریاتی وابستگی جس طرح اثرانداز ہوتی ہے اسکا اندازہ
ہندوستان کی تاریخ نویسی کے مختلف رجحانات سے لگایا جا
سکتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر رومیلا تھاپر نے اپنے ایک
مقالہ میں افادیت پرستوں (Utilitarians) کی تاریخ نویسی
اور پھر اس کے ردعمل کے طور پر ہندوستان کے قوم پرست
مورخوں کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ مل (Mill) اور دوسرے
افادیت پرست (Utilitarians) برطانوی مورخین کا خیال
تھا کہ وہ برطانوی نوآبادیات کے غیر متمدن محکوم اقوام
کو علم اور تہذیب کا درس دینے کے تاریخی منصب کو پورا
کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نے ہندوستان کی تاریخ کو

ایک مخصوص نقطۂ نظر سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے قوم پرست مورخوں نے اپنے وطن کے دورِ قدیم کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ مغربی اثرات کے عام ہونے سے قبل بھی ہندوستان ایک تہذیب یافتہ اور متمدن ملک تھا۔ ؎

تاریخ نویسی کے یہ مسائل اُس وقت اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب مورخ اس ملک سے تعلق نہ رکھتا ہو جس ملک کی تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہے۔ ایسے موضوع پر بنیادی ماخذوں تک رسائی حاصل نہ ہو پاتا یا ان سے ناکافی واقفیت ہونا یا تہذیبی متاثرت اور اقدار کا اختلاف یا مقاصد اور نیت کا مختلف ہونا، یہ سب امور دیانتدارانہ تاریخ نویسی کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں اور ایسے موضوع پر تاریخ اور مورخ کے اندازِ نظر دونوں کے درمیان تضاد یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ملا۔ کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک

ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے نے اسے ایک ملک کی قومی سوانح عمری کہا ہے۔ سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگلستان کی ادبی تاریخ اس کی قومی روح کے اخلاقی آہنگ کا زیروبم ہے۔ کچھ لوگ اسے فن کی تاریخ سمجھتے ہیں جس میں دلچسپی کے لئے مصنفین کی سوانح عمریاں اور کچھ منفرد فن پاروں کی قدر شناسی (appreciation) شامل ہو۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ ایسا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے۔ اے۔ سیمنڈز ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقاء ادبی تاریخ کا سب سے اہم جز ہے کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے ہیں اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض جرمن اور امریکی فلسفیوں نے اس وجہ سے ادب کے ارتقاء کو جمالیات کے ارتقاء کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس مطالعے سے ادب کے مطالعے کے لئے اصول اخذ کئے ہیں۔

ادبی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں ادیبوں اور دانشوروں میں کافی اختلاف رائے رہا ہے اور یہ اختلاف ادیبوں کو ایسی جگہ

لاکر کھڑا کردیتا ہے جہاں ایسا گروپ جو ادب کی سماجی افادیت
کی وکالت کرتا ہے، ادبی تاریخ لکھنے کا قائل ہے اور وہ لوگ
جو ادب اور سماج کو الگ الگ کرکے دیکھنے کے قائل ہیں،
ادبی تاریخ لکھنے کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے
کہ ان دو گروہوں میں آپس میں بالکل اختلاف رائے رہا ہو بلکہ
مختلف لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو الگ الگ طرح سے
سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ـــ ٹامس وارٹن (Thomas
Warton) ادبی تاریخ کے مطالعے کا اس لئے قائل ہے کیونکہ یہ زمانے
کے واقعات کو باقاعدگی سے قلم بند کرتا ہے اور اسطرح بے حد
دلکش طرز معاشرت کا واضح نقشہ پیش کرتی ہے اور اسے محفوظ
رکھتی ہے۔[۱۱] ـــ ہنری مارلے ادبی تاریخ کو ملکی تذکرہ
(National Biography) اور انگریزی ذہن کی کہانی سمجھتا ہے[۱۲]

اس سماجی نظام میں کچھ لوگ تاریخ بناتے ہیں اور کچھ
دوسرے لوگ اس بنی بنائی تاریخ کا استعمال کرتے ہیں۔ جو تاریخ
بناتے ہیں وہ تخلیقی عمل کی فکر کرتے ہیں اور جو اسکا استعمال
کرتے ہیں وہ تخلیقی عمل کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں ـــ
انسان اپنی تاریخ کا تجزیہ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے بناتا اور بدلتا بھی
ہے۔[۱۳]

ادبی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے مینیجر پانڈے نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ صرف جانور ہی تاریخی سمجھ اور تخلیق کی ذمہ داری سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ کے مخالف ہیں وہ بنیادی طور پر ادب کی جمودیت، ادبی روایات کی آزادی یا مجموعی اعتبار سے ادب برائے ادب کے قائل ہیں لیکن دوسری طرف ادبی تاریخ کے حامی بھی۔ یہ لوگ ادب کو تاریخ وار سلسلۂ واقعات سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ ادب کا تہذیبی روپ بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے ادبی اثرات اور سارے سماج کو سامنے رکھکر اسکا تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو صرف حقائق یکجا کرنے تک محدود کر دیا اور انہیں بنیاد پر تاریخ نویسی کے مخالفین نے ان کمزوریوں سے فائدہ بھی اٹھایا۔

کیر نے ادبی تاریخ نویسی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ادبی تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسکا مقصد ہمیشہ حال کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔[14] گرگٹ نے تاریخ نویسی کی مخالفت آل رائے کی کر اسے ایک شخص لکھتا ہے۔[15] رنے ولک نے بہت ہی بنیادی سوال اٹھایا کہ اس طرح تمام علوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اور سارے علوم کو یکسر کہکر رد کیا جا سکتا ہے کیونکہ لکھنے والا ایک فرد واحد ہوتا ہے۔[16]

ادبی تاریخ نویسی کی مخالفت کرتے ہوئے بیٹسن کہتا ہے کہ

ادبی تاریخ میں ایک چیز دوسرے سے ماخوذ ہوتی ہے اور جبکہ تنقید میں ایک چیز کو دوسرے سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ [۱۷] اسٹوح اس کے خیال کے مطابق پہلے تو مختلف حقائق کی روشنی میں ادب کا تجزیہ ہوتا ہے اور پھر نظریات اور اعتقادات کا دخل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں غیر جانبدار حقائق نہیں ہوتے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غیر جانبدار حقائق ہوتے ہیں تو یہ حقائق تاریخ، عنوان یا سوانحی واقعات تک محدود ہوتے ہیں جن سے ادب کی تاریخی اسناد کی تدوین تو ہو سکتی ہے لیکن ادبی تاریخ لکھنے کے لئے صرف یہی چیزیں درکار نہیں ہوتیں۔ تاریخ نویسی کے سلسلے میں بہت سی خام خیالیوں کا ذکر کرتے ہوئے رنے ولک نے لکھا ہے کہ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ نویسی میں تنقید کی مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے آپ میں نادانستہ طور پر خود بھی نقاد ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر روایتی معیار کی چھاپ ہے اور آج کے دور میں انکی حیثیت ایسے شب گزیدہ رومانوی (Belated Romanticists) لوگوں کی ہے جنہوں نے تمام ادب اور خصوصاً جدید ادب کی سمجھ سے منہ موڑ لیا ہے یا سوچنا بند کر دیا ہے۔ [۱۸]

اہم یہ ہے کہ ادبی تاریخ لکھتے وقت کسی ادب پارے کے وجود میں آنے کے اسباب یعنی ماخذ اور اثرات کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم بیسویں صدی کی ادبی تاریخ لکھ رہے ہیں تو اس بات کا علم ضروری ہے کہ انیسویں صدی اور اس سے پہلے کی ادبی اقدار کیا تھیں اور جس زمانے کی تاریخ لکھی جا رہی ہے' اس زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کیا تھے اور مختلف اصناف کی مختلف ادوار میں کیا اہمیت تھی اور اس کے اسباب وغیرہ۔

اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے رنے ولک نے اپنی تصنیف Theory of Literature میں اسے ایک نئے طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ بیٹسن کے اس نظریے سے بحث کرتا ہے کہ ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں حقائق ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتے ہیں یا ایک چیز کو دوسری سے بہتر ثابت کیا جاتا ہے۔ ولک نے بجا طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دونوں صورتوں سے تنقیدی شعور کا عمل دخل لازم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقاد اپنے دور کے مطابق قدیم ادبی شہ پاروں کو پرکھتا اور جانچتا ہے جبکہ ادبی مورخ کے سامنے ادبی شہ پارے کا زمانہ ہوتا ہے۔ تنقید کا رشتہ حال سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، ادبی تاریخ کا ماضی سے۔

ادبی مورخ کو صرف اپنے زمانے ہی کی مذاق میں شہ پاروں کو پرکھنا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کے آئینے میں بھی شہ پارے اور ہر ادبی تحریک کو دیکھنا ہوتا ہے۔ گویا مورخ کے نزدیک مرکزی اہمیت خود ادیب کے مقصد کی تشکیل نو کی ہوتی ہے اور ادیبوں کے مقاصد کے آئینے میں بدلتی ہوئی حیثیت کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی مدد سے تاریخ کی ترتیب نو کرتا ہے اور اس کے سامنے کسی فن پارے کی اس کے اپنے دور میں مقبولیت کا معیار ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت کوئی بھی فن پارہ نہ تو محض تاریخ کا گزرا ہوا واقعہ ہے جکو صرف اس کے اپنے ہی دور کے پس منظر میں رکھکر دیکھنا اور پرکھنا ضروری ہو اور نہ کوئی ایسی ازلی اور ابدی تخلیق ہے جس کا کوئی تعلق اس کے زمانے اور ماحول سے نہ ہو۔ یعنی وہ بیک وقت بدلتے ہوئے تاریخی لمحوں کی زد میں بھی ہے اور مکمل طور پر ان بدلتے ہوئے حالات کا شکار بھی نہیں ہے کیونکہ اپنے زمانے اور ماحول کے ختم ہو جانے کے صدیوں بعد بھی زندہ رہتا ہے اور پڑھنے والوں کو لطف اندوز کرتا ہے۔ اس لئے ولک نے تاریخ ادب کے سلسلے میں تاریخیت (Historicism) اور مطلقیت (Absolutism) دونوں کو رد کر کے ایک نئی اصطلاح منظریت

(Perspectivism) وضع کی جس سے یہ لازم آتا ہے کہ نہ تو
کسی فن پارے کو محض بیتی ہوئی تاریخ کا حصّہ سمجھ کر اسے پرانے
زمانے کے نوادر کی طرح مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی شہ پارے
کے زمانے اور علاقے کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اسے
تاریخ سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ دونوں زاویۂ نگاہ سے
اسے دیکھنا لازم ہے اور تاریخ ادب اسی دوہری بصیرت کو
کام میں لاتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ادبی تاریخ ادب کو نہ محض ادبی فن
پاروں کی جمالیاتی کیفیات یا تنقید قرار دیا جا سکتا ہے نہ محض
بدلتے ہوئے مذاقِ سخن کی دستاویز۔ بلکہ وہ زبان اور ادب
کے نشوونما کی داستان بھی بیان کرتی ہے اور ان کے پیچھے بدلتے ہوئے
ادبی ذوق کی کہانی بھی کہتی ہے۔ ادبی تاریخ ادب اور سماج دونوں
کو ایک مکمل اکائی کی شکل میں دیکھتی ہے اور ادب کو سماج کی
تخلیق اور ادب کے سماج پر اثرات دونوں کے رابطے سے بحث
کرتی ہے۔ ادب نہ تو محض خیالات سے عبارت ہے نہ محض جمالیاتی
کیفیات سے بلکہ ان دونوں سے مل جل کر جو حیثیت انفرادی
اور اجتماعی سطح پر رونما ہوتی ہے وہ کسی اور کی آپ بیتی کا حصّہ
بھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تاریخ، تاریخ کا تکملہ بھی ہے

اور ادب کا بھی۔ ادبی تنقید اس سماجی سیاق و سباق کو کس حد تک چھوڑنے پر اس وجہ سے مجبور ہے کہ وہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ تاریخ ادب اسے فراہم کرتی ہے اور صرف مورخ کے ادبی ذوق ہی پر اسے نہیں پرکھتی بلکہ ان سماجی حالات کے پیش نظر بھی اسے پرکھتی ہے جن میں فنکار یا ادبی تحریک کی تخلیق ہوئی۔ اسی طرح تاریخ جن ادبی حسیت کو نظر انداز کرکے محض واقعات اور افکار کی مدد سے اپنے دور کا نقشہ تیار کرنے پر خود کو مجبور پاتی ہے تاریخ ادب اسے مختلف ادوار میں پلنے والی اس لطیف حسیت کا تجزیہ کرنے اور اسے مربوط اور منضبط شکل میں پیش کرنے اور ان کے سماجی عوامل و محرکات سے ہم آہنگ کرنے کا نام ہے۔ اس طرح تاریخ ادب لازمی طور پر ادب اور سماج کے درمیان رشتے کا کام دیتی ہے۔

لہٰذا تاریخ یا تاریخ ادب دونوں کے لئے مورخ کے انداز نظر اور اسکی پسندیدگی و ناپسندیدگی کے معیار کی اثراندازی ضروری ہے۔ جس طرح ہر ادب پارے میں اتفاقی (accidental) اور لازمی (essential) عناصر موجود ہوتے ہیں اور ادبی نقاد کا فرض ہے کہ اتفاقی (یا روایتی) عناصر کو الگ کرکے فن پارے کے بنیادی اور لازمی امتیازی اجزا کی شناخت فراہم کرے۔

اسی طریقے پر ادبی مورخ کے لئے لازم ہے کہ وہ ادبی تاریخ کے مختلف اتفاقی عناصر کو نظر انداز کر کے اس کے لازمی عناصر پر زور دے۔ اس عمل میں نہ صرف ادبی مورخ کی بصیرت کام آتی ہے بلکہ اس کی جانبداری، اسکا تاریخی شعور، اس کی پسند و ناپسند کے معیار، اس کے نسلی و نظریاتی تعصبات سبھی کسی نہ کسی طرح ادبی تاریخ کی ترتیب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی مرکزی تصور کو گولڈمان نے ادبی مورخ کے عالمی تصور (World vision) سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۹

ادبی مورخ کے لئے دوسرا اہم مرحلہ خود زبان کی پیدائش اس کی ماہیت اور اس کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات کی چھان بین اور رد و قبول ہے — کیونکہ یہاں مسئلہ کسی فن پارے کی جمالیاتی قدر و قیمت کے تعین کا نہیں ہے بلکہ زبان کی تخلیق و تشکیل میں معاون ہونے والے گوناگوں سماجی، اقتصادی و تہذیبی عوامل و محرکات کے باہمی عمل و رد عمل کا ہے جس کے نتیجے کے طور پر نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور نئی زبانیں بنتی ہیں اور نئے نئے اسلوب پروان چڑھتے ہیں۔ اس مرحلے میں ادبی مورخ محض ادب اور جمالیات کی حدبندیوں میں رہ کر کام نہیں کرتا بلکہ اسکو تہذیب کی تشکیل

دینے والے اور زبان کو بنانے والے سبھی عناصر کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور ان کی آمیزش سے پیدا ہونے والے اثرات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے گویا ادبی مورخ، ادبی تاریخ کی ابتداء ہی میں ادب اور تہذیب، ادب اور سماج کے باہمی رشتوں پر غور کرنے پر مجبور ہے اور اس تجزے میں لازمی طور پر اسے کوئی نہ کوئی تصور تاریخ بھی اپنانا ہوتا ہے اور ادب، زبان اور تہذیب کے رشتوں کو کسی نہ کسی نظریاتی رخ سے پیش کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ مختلف ادوار اور علاقوں کے ادب کے درمیان یکسانیت اور اختلافات کی تلاش ہے۔ اگر ہر ادبی فن پارے کو ایک منفرد اور دوسروں سے کٹا ہوا جزیرہ سمجھا جائے تو ادبی تاریخ کا تصور ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے ہر ادبی مورخ کو ایک دور میں لکھے جانے والے ادبی فن پارے کا تقابلی مطالعہ، دوسرے دور میں لکھے جانے والے ادبی فن پارے سے کرنا ہوتا ہے اور پھر ان میں سے ہر دور کے فن پاروں کے درمیان انفرادی خصوصیات کے باوجود ایسے اجتماعی امتیازات کا پتہ لگانا ہوتا ہے جو کسی ایک دور کے فن پاروں کی شناخت بن سکیں اور انھیں دوسرے دور یا دوسرے علاقوں کے

فن پاروں سے الگ کر سکے۔ یعنی ادبی مورخ ادبی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ اور ان کی ادبی خصوصیات متعین کرتا ہے۔ اسی طرح ادب میں مختلف تحریکوں کی نشاندہی اور ان کے زیر اثر تخلیق کردہ فن پاروں کی شناخت بھی ادبی تاریخ کے دائرے میں آتی ہے۔

تیسرا مرحلہ ادب کے تاریخی اور جمالیاتی تسلسل اور اس کے مزاج کی پہچان کا مرحلہ ہے۔ ہر ادب دوسرے ادبیات سے بہت کچھ اثرات قبول کرتا ہے۔ لیکن اس اثر پذیری کے باوجود شاید ہی کوئی ادب ہو جس کی کوئی امتیازی ادبی روایت نہ ہو اور اس کے ادبی فن پاروں کے معیار و اقدار اس مخصوص روایتی پیمانوں پر طے نہ ہوتی ہوں۔

یہ تمام مراحل یوں بھی ہر ادبی مورخ کو پیش آتے ہیں اور جسطرح غالب نے اشعار کے انتخاب کو اپنے دل کا معاملہ کھلنے کا سبب بتایا تھا:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اسی طرح ہر ادبی مورخ کی تاریخی بصیرت

اور اس کی تہذیبی و نظریاتی وابستگیوں کا حال اسکی مرتب کردہ تاریخ ادب سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اگر مورخ کسی دوسرے ملک یا نسل کا ہو یا مختلف ادبی روایات و لسانی روایات سے تعلق رکھتا ہو تو یہ پیچیدگیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ مستشرقین کے سلسلے میں یہ دقتیں اسی بناء پر کئی اعتبار سے نہایت فکر انگیز اور پیچیدہ ہو گئی ہیں۔

Thesis
O,168.56'N
168M2

TH-1145

# حوالے

۱ Eichen Baum – Literary Environment – 1929

"History is a Special method of studying the present with the aid of the facts of the past."

۲ E. H. CARR – What is History – Page: 21
(Penguin Books – 1976)

"--- history consists essentially in seeing the past through the eyes of the present and in the light of its problems, and that the main work of the historian is not to record, but to evaluate; for, if he does not evaluate, how can he know what is worth recording?"

۳ Ibid — Page: 23

"Study the historian before you begin to study the facts."

5. E.H.CARR – What is History Page : 24

"History can not be written unless the historian can achieve some kind of contact with the mind of those about whom he is writing."

6. Ibid Page : 8

"What I want is Facts --- Facts alone are wanted in life."

7. Atlantic Monthly, Oct. 1910, Page : 528

"--- the facts of history do not exist for any historian till he creates them."

8. B.Croce – History as the Story of Liberty (English Translation, 1941 Page : 19)

"The practical requirements which underlie every historical judgement give to all history the character of "Contemporary history", because, however remote in time events thus

— contd.

recounts may seem to the history in reality refers to present needs and present situations wherein those events vibrate."

c. "The history of all hitherto existing society is the history of class struggles."

d. E. H. CARR — What is History Page: 22

"...history... the reconstitution of the past in the historian's mind is dependent on empirical evidence. But it is not in itself an empirical process, and can not consist in a mere recital of facts. On the contrary, the process of reconstitution governs the selection and interpretation of the facts."

e. Romila Thapar — Communalism and the Writing of Indian History Pages: 1, 5 & 4.
(P.P.H., New Delhi)

"Thus, Hindu communalists try and project

—contd.

an ideal Hindu society in the ancient period and attribute the ills of India to the coming of the 'Muslims'. Equally, Muslim communalists try and prove the roots of separatism from the beginning of the medieval period onwards, i.e., from the 11th or 13th century A.D. (P.1)

Where nationalism is coupled with colonialism and an anti-imperialist situation, then the glorification of the past serves as a kind of consolation for the humiliation of the present. (P.5)

--- Mill's History of British India was that in a sense it laid the foundation for a communal interpretation of Indian history and thus provided the historical justification for the two-nation theory. He was the first his-

— contd.

torian to develop the thesis of dividing Indian history into three periods which he called Hindu civilisation, Muslim Civilisation and British civilisation (interestingly enough, not Christian civilisation)." (P.4)

ح۱۱ Thomas Warton — History of English Poetry ; I (1774) Page : II

"--- faithfully records the feature of the time and preserves the most picturesque and expressive representation of manners."

ح۱۲ Henry Morley — English Writers Page : I (London - 1864)

ح۱۳ मैनेजर पाण्डेय — आलोचना (त्रैमासिक) अं. 36

— अप्रैल-जून '७६ पृष्ठ 9

ح۱۴ W. P. Ker (ص ۲۵۵ Theory of Litt. بحوالہ رینے ویلک)

ح۱۵ F. J. Treggart — Theory of History (بحوالہ رینے ویلک)

ح۱۶ Rene Wellek and Austin — Theory of Literature

Page - 255

ح ۱۷ F.W. Bateson (بحوالہ رشید ملک - ص ۔)

"Literary history shows A to derive from B, while criticism pronounces A to be better than B."

ح ۱۸ Rene Wellek and Austin Warren,

Theory of Literature - Page: 43

"Literary historians who deny the importance of criticism are themselves unconcious critics, usually derivative critics, who have merely taken over traditional standards and reputations. Usually, today, they are belated Romanticists who have closed their minds to all other types of art and especially to modern literature."

ح ۱۹ Lucien Goldmann: "The Hidden God" Page: 14

"It thus follows that the history of philosophy and literature can become

— contd.

scientific only when an objective and verifiable instrument has been created which will enable us to distinguish the essential from accidental elements in a work of art; the validity of this method will be measured by the fact that it will never proclaim as accidental works which are aesthetically satisfying. In my view such an instrument is to be found in the concept of the world vision."

عام طور پر ہم مشرقی علوم یا ایشیائی
علوم میں دلچسپی رکھنے والے شخص کو مستشرق کہہ سکتے
ہیں - لیکن مشرقی علوم یا ایشیائی علوم گو کہ ایک دوسرے
کا بدل نہیں، پھر بھی ان میں بہت زیادہ فرق بھی
نہیں ہے — عموماً مستشرق وہ کہلائے گا جس کی دلچسپی
مشرقی زبان اور ادب میں ہو - دوسرے علوم کی طرف جو
زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی وہ انیسویں صدی سے کافی
نمایاں نظر آتی ہے - مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستشرق
وہ ہے جو اپنے علم کا آغاز کسی مشرقی زبان سے
کرتا ہے اور جس کی دلچسپی آگے چل کر ایشیائی
کلاسیکی کلچر یا ادب میں نمایاں ہوتی ہے — ایشیائی
عالم وہ ہوگا جو زبان و ادب کے علاوہ کسی ایک
ایشیائی علاقے یا ملک کے مطالعے میں دلچسپی رکھتا
ہے اور اس مخصوص علاقے کی زبان اس لئے سیکھتا
ہے کہ وہ اس کے موضوع کے لئے ضروری ہوتا
ہے -

یہ کہنا غلط ہوگا کہ علم مشرق (Oriental
Studies) کا دائرہ ایشیائی حدود سے آگے بھی
بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً سوویت روس کے وہ علاقے
جو ایشیائی حدود سے باہر ہیں، وہ بھی مستشرقین
کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے، ان کے
اور ایشیائی کلچر میں بہت مماثلت رہی ہے۔
مستشرق کی تعریف کرتے ہوئے مشہور مستشرق
اے۔ جے۔ آربری کہتا ہے، یہ ایسا میدان ہے جو کسی کا نہیں
اور سب کا ہو سکتا ہے جس میں ماہر علم آثار قدیمہ، تاریخ
نویس، ماہر علم اشتقاق، ماہر صوتیات، فلسفی، ماہر
دینیات اور موسیقار سے لیکر آرٹسٹ تک، سبھی
شامل ہو سکتے ہیں۔ [1]
اس لفظ کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے
وہ کہتا ہے کہ پہلی مرتبہ اس لفظ کا استعمال ایک
مشرقی یا یونانی چرچ کے ممبر نے ۱۶۸۳ء میں کیا اور
پھر ۱۶۹۱ء میں انتھونی ووڈ (Anthony Wood) نے
سیمول کلارک (Samual Clark) کا ذکر کرتے ہوئے
اسے ایک مشہور مستشرق (aneminent Orientalist)

کہا جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ کچھ مشرقی زبانیں جانتا تھا۔

عام طور پر مستشرقین سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہندوستانی علوم اور بالخصوص اردو ادب کی تحقیق، تعلیم و تاریخ کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

یوں تو ہندوستان اور یورپ کے باہمی تعلقات بہت پرانے ہیں لیکن سیاست اور تجارت کی بناء پر دونوں میں جو گہرا تعلق پیدا ہوا اس نے یورپی علماء کو ہندوستانی علوم پڑھنے اور ہندوستانی زبانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا موقع بہم پہنچایا اور اس طرح شرق و مغرب میں تہذیبی لین دین کا ایک تاریخ ساز سلسلہ شروع ہوا۔ اس ضمن میں سر ولیم جونس (Sir William Jones) کی لسانیاتی دریافت سامنے آئی جس کے ذریعے وہ سنسکرت کو دنیا کی بیشتر زبانوں کا ماخذ قرار دیتا ہے اور مختلف زبانوں کو تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کرتا ہے۔

میکسمولر (Maxmuller) نے ہندوستانی ادبیات اور عقائد کا مطالعہ کیا اور گارساں دی تاسی نے فرانس میں بیٹھ کر ہندوستان اور بالخصوص اردو ادب کی سال بہ سال ترقی کا جائزہ لیا۔ اس طرح لسانیات، تہذیب اور ادب میں مستشرقین کی خدمات کی بدولت عالمی سطح پر علم میں اضافہ ہوا اور تہذیب کی تفہیم اور ادراک میں مدد ملی۔

مستشرقین میں دو قسم کے علماء تھے۔ اول وہ جن کا خیال تھا کہ صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس اور سائنسی ترقیوں کی بدولت انسانی تہذیب کا جو ورثہ یورپ کے ہاتھ آیا ہے اسے باقی دنیا تک پہنچانا یورپ کا تاریخی فرض ہے اور لبرلزم (libralism) کی اس تاریخی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے بنتھم (Banthem) اسٹورٹ مل (Stuert-Mill) اور ان سے متاثر ہونے والے دانشور اور سیاست داں یہ محسوس کرتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں نشاۃ ثانیہ کے خیالات اور تصورات عام کرنا اور عالمی تہذیب کے اقدار کو فروغ دینا ان کا فرض ہے۔

دوسرے وہ لوگ جو انتظامی ضروریات کی بناء پر
یہ محسوس کرتے تھے کہ محکوم قوم کے عادات و اطوار
تہذیب و تمدن سے واقفیت بہم پہنچانا بہتر انتظام
اور بہتر حکومت کے لئے ضروری ہے۔ ان میں وارن
ہیسٹنگز اور ویلزلی سے لیکر جان گل کرسٹ اور چارلس
مٹکاف شامل ہیں۔

اس کے برخلاف انگریز کی سیاست
دانوں اور ارباب انتظام میں ایک ایسا گروہ شامل تھا
جو محسوس کرتا تھا کہ ہندوستانی تہذیب سے واقفیت
اور یہاں کے ادبیات پر عبور حاصل کرنا محض فضول
ہوگا کیونکہ اس صورت میں ہندوستانی، عالمی تہذیب کے
بہتر تصورات سے آشنا نہیں ہوں گے اور اپنی پرانی
دنیا میں کھوئے رہینگے ــــــ اس طرزِ فکر کی بہترین نمائندگی
لارڈ میکالے نے کی ــــ برطانوی حکومت کے دوران
جب ذریعۂ تعلیم پر بہت اختلافات پیدا ہوئے تو میکالے
نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے (جو ہندوستانی
علوم حاصل کرنے پر زور دیتے تھے) کہا کہ وہ ابھی
تک مشرقی زبان کے کسی ایسے عالم سے نہیں ملا

جو یہ ثابت کر سکے کہ مشرقی علوم کا سارا ذخیرہ،
یورپ کے کلاسیکی ذخیرے کے ایک خانے کے برابر
بھی ہو سکتا ہے۔

آربری نے میکالے کے اس قول کا مذاق
اڑاتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بات سچ مان لی جائے تو گویا
اب تک برطانوی عالموں نے مشرقی ادب کے میدان میں
جو کام انجام دئے ہیں ان کا مقصد وقت ضائع
کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔[۲]

ان دونوں طرز فکر کا اظہار ایسٹ انڈیا کمپنی
کی تعلیمی پالیسیوں میں بھی برابر ہوتا رہا ہے۔ شروع
میں ہندوستانی علوم پر زور دینے کی کوشش میں کلکتہ مدرسے
کا قیام، فورٹ ولیم کالج، ہندو کالج اور دہلی کالج وجود
میں آئے اور ان کے لئے نصابی کتابیں تیار کی گئیں
اور تمام علوم و فنون کی تعلیم یہیں کی زبانوں میں
دی جانے لگی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ عیسائی مشنریوں
نے انجیل مقدس کے تراجم اردو و دوسری ہندوستانی
زبانوں میں شائع کئے اور اردو کی قواعد و صرف و نحو کی

کتابیں بھی تیار کی گئیں۔ لغات مرتب کی گئیں، مختلف یورپی زبانوں سے اردو میں ترجمے کئے گئے اور اس کے ذولسانی لغات تیار کی گئیں۔

مستشرقین نے اردو ادب کے مختلف نمونے یکجا کئے، آسان نثر کا اسلوب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں میر امّن کی تصانیف خصوصاً باغ و بہار اور گل کرسٹ کی کوششیں اہم ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش اور اس ضمن میں گارساں دی تاسی کے خطبات و مقالات اور اس کی ہندوستانی ادب کی تاریخ، اس کے اسپرنگر کے کیٹالاگ (شاہان اودھ کے کتب خانے) اور گل کرسٹ کے مضامین خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹوری (Storey) کی مرتب کردہ فارسی ادب (Persian Literature) - تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں گراہم بیلی کی تصنیف نہ صرف کسی فرنگی بلکہ اردو دنیا میں بھی کسی اردو داں کے ذریعے اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی پہلی کوشش تھی۔

اس کے علاوہ مستشرقین نے دورِ حاضر میں بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی اور خصوصاً اردو کو تجزیاتی بصیرت اور حکیمانہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں شمل، رالف رسل اور ڈیوڈ میتھیوز وغیرہ اہم ہیں۔

مستشرقین کی اس مختصر تعریف کے ساتھ ہمیں یہ بھی غور کرنا ہوگا کہ مختلف ادوار میں ان کے کارناموں اور دلچسپیوں کی نوعیت الگ الگ رہی ہے عہد قدیم سے ہندوستان مختلف یورپی سیاحوں، مشنریوں اور تاجروں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے سے یونانی اور ہندوستانی تہذیبوں کا میل رہا ہے۔ بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کی مشترکہ روایات دیکھنے کو ملتی ہیں اور اسکی اعلیٰ مثال حضرت سلیمان کی کہانی ہے۔ بدھ مذہب کی روایت کے مطابق جب جب دو عورتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ بچہ انکا ہے تو دونوں کو اس بچے کو آدھا آدھا بانٹ لینے کا حکم ملتا ہے اور کھینچاتانی میں جب بچہ درد سے چیختا ہے تو وہ عورت جو اصل میں بچے کی ماں ہوتی ہے، بچے کو چھوڑ دیتی ہے

اور کہتی ہے کہ اسے کچھ نہیں، بچے کی زندگی چاہیئے۔ ۳ے
۔ اس طرح کی بہت سی کہانیاں ملتی ہیں جو اس بات کا
ثبوت ہیں کہ مغرب و مشرق میں تہذیبی اقدار کی
مشترک روایات رہی ہیں ۔

لیکن اس دور میں تہذیبوں کے اس میل
کی وہ شکل نہ تھی جو بعد کو نظر آتی ہے۔ چاہے وہ
چینی سیاح ہیوان سیانگ ہو یا یورپی سیاح یا مورخ۔ ان کی
دلچسپی کا مرکز علم کی تلاش اور مختصراً علم برائے علم
پر ہے۔ لیکن واسکوڈی گاما اور کولمبس کی آمد کے
بعد سے ان کی دلچسپیوں میں تبدیلیاں آتی ہیں اور اب
ان کی دلچسپیاں محض علم برائے علم تک محدود نہیں
رہیں بلکہ ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوا ۔ ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء
کو جب واسکوڈ گاما وارد ہندوستان ہوتا ہے اور اس کی
آمد کا مقصد پوچھا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ اسکا
مقصد عیسائیت اور مسالے (Christian & Spices)
ہیں۔ یعنی اب نئے ممالک کی دریافت کے ساتھ نئے ممالک
کی تہذیب و تمدن کے مطالعے کے نئے راستے ہموار ہونے
کے ساتھ سلسلۂ تجارت کی بھی ابتداء ہوئی اور مستشرقین

کے رویوں میں قدرے فرق آیا۔ لیکن ابھی بھی وہ پرانی قدریں باقی تھیں اور علمی مطالعے ابھی بھی اہم رول ادا کر رہے تھے ۔ رالنسن کے مطابق پہلا انگریز جو ۱۵۷۹ء میں گوا پہنچا وہ فادر ٹامس اسٹیونسز (Father Thomas Stevens) تھا۔ ۳۶

فادر ٹامس کی دلچسپی ایک مشنری ہونے کے باعث عیسائی مذہب کو فروغ دینے میں ہی تھی اور مقصد تاجرانہ قطعی نہیں تھا۔ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے مشرقی زبانوں میں دلچسپی لی اور ۱۶۱۵ء میں کوکنی بولی کی قواعد لکھی۔ یہیں اس نے مراٹھی زبان سیکھی اور اس زبان کی بہت تعریف بھی کی اور کہا کہ " مراٹھی زبان سنگ ریزوں میں جواہر کی مانند، جواہر میں نیلم کی طرح ہے ، گلوں میں یاسمین کی طرح اور خوشبو میں مانند مشک، پرندوں میں مور کی طرح اور ستاروں میں منطقۃ البروج جیسی ۔" ۳۷

ہندوستان اور برطانیہ کے تجارتی رشتے مغل سلطنت کے دور سے شروع ہو گئے تھے جب ۱۵۸۳ء میں انگریز تاجروں کی ایک ٹیم ملکہ الزبتھ (Queen Elizabeth) کا خط لیکر جہانگیر کے دربار پہنچی جو شہر طولی اور بصرہ ہوتے ہوئے

ہرمز پہنچے اور پرتگالیوں نے انھیں گرفتار کر کے گوا بھیج دیا۔ کسی طرح سے آزاد ہو کر یہ لوگ رالف فیچ (Ralf Fitch) جان نیوبری (John Newbery) اور ولیم لیڈز (William Leeds) ۱۵۸۵ء میں آگرہ کے دربار میں پہنچے اور بعد میں ان میں سے صرف فیچ برطانیہ واپس جاسکا۔ فیچ نے آگرہ شہر کو بہت خوبصورت اور بڑا بتایا ہے۔ [۲]

۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جہانگیر سے اس بات کی اجازت مل گئی کہ سورت میں تاپتی ندی کے کنارے ایک فیکٹری قائم کر سکیں اور یہیں سے انگریزوں کے پیر ہندوستان میں جمنے شروع ہو گئے۔

یہ سچ ہے کہ انگریزوں کی باقاعدہ آمد ہندوستان میں تاجروں کے طور پر تھی اور یہاں کی تہذیب و تمدن میں انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن ان میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو یہاں کی تہذیب و تمدن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ہندوستان کی زمین پر قدم بھی نہیں رکھا اور ہندوستانی کلچر کو اپنی تخلیق میں شامل کیا۔ ان میں جان ملٹن کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے جو کچھ دیکھ تو نہیں سکا لیکن سر ٹامس رو کے ذریعے

حاصل کی ہوئی معلومات کی بنیاد پر انھیں اپنی شاعری میں
شامل کیا ہے

اس کے علاوہ ۱۶۷۵ء میں ڈرائڈن
نے اپنے ڈرامے اورنگ زیب میں سترھویں صدی کے
مغل دور کی تصویر کشی کی ہے جسے دو فرانسیسی
سیاحوں ٹوَرنئی (Tavernier) اور برنئی (Bernier) نے
اور آگے بڑھایا اور جن کا ترجمہ ۱۶۸۴ء میں انگریزی
میں ہوا۔

یہ وہ دور ہے جب مشرقی ادب
میں دلچسپی رکھنے والوں کی نظریں تاجرانہ نہ تھیں۔
مشرقی علوم کا مطالعہ علم حاصل کرنے کی غرض سے
ہو رہا تھا جن میں ملٹن اور میکسمولر (Maxmuller)
جیسے علماء شامل تھے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں
کی آمد کے بعد ہندوستانی علوم و ادب کا مطالعہ
جن یورپی علماء نے کیا ہے ان میں کچھ حد تک
مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا دخل بھی رہا ہے اور
اس دور میں زیادہ کام اگر ہوا ہے تو وہ عربی
اور فارسی کے میدان میں ہوا۔ لیکن ایسا نہیں کہ ہندوستانی

علم و ادب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو ۔ ایسٹ انڈیا
کمپنی کے قیام کے بعد ایک طویل عرصے تک انگریزوں کا
رویہ صرف زر حاصل کرنا تھا اور باقاعدہ طور پر یہاں
کی تہذیب و تمدن اور تعلیم پر کوئی دھیان نہیں دیا
گیا ۔ ابھی تک انگریز یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں یہاں
سے دولت حاصل کرنی ہے اور اس کے علاوہ
ان پر کوئی اور ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔ لیکن
ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ان
لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ دولت حاصل کرنے کے
لئے بھی یہاں کی تہذیب کو سمجھنا ہوگا ، ہندوستانیوں
کو حکومت کا فرماں بردار بنانے کے لئے ایک دوسرے
کو سمجھنا ہوگا ۔ اس لئے اظہار و ترسیل کا مسئلہ ضروری
ثابت ہوا اور اسی ضرورت کے پیش نظر وارن ہیسٹنگز
(Warren Hastings) نے پنڈتوں اور مولویوں کو
ملازمت دی ، انھیں ضروریات کی بناء پر ۱۷۸۱ء
میں اسلامی تعلیمات کے لئے کلکتہ مدرسے کا قیام
اور ۱۷۹۲ء میں بنارس میں سنسکرت کالج کا قیام وجود
میں آیا ۔ ساتھ ہی ۱۷۹۲ء میں مدرسۂ غازی الدین

جو بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، قائم ہوا۔
دہلی کالج کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
نے لکھا ہے کہ "دہلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی
کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے
حامی (Orientalists) عمل پیرا تھے اور جو اس وقت
جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے
علاوہ یورپ میں ہندوستانی علوم کی دید و دریافت
کی بڑی قدر تھی۔ گوئٹے کے توصیفی اشعار
سر ولیم جونس (Sir William Jones) کے تحقیقی
مقالات اور ولیم رابرٹسن (William Robertson) کے
تہذیبی انکشافات نے ان کی مقبولیت اور اہمیت
کو بڑھا دیا تھا۔ بعض برطانوی حکمران، ہندوستانی
علوم کی سرد بازاری پر آزردہ تھے اور ان کا
احیاء چاہتے تھے۔ لارڈ منٹو نے ۶ مارچ ۱۸۱۱ء
کی یادداشت میں لکھا تھا کہ "ہندوستانی علوم کی
تعداد گرتی جاتی ہے اور علم کا دائرہ تنگ سے
تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔" اس پر کلکتہ ریویو کے مقالہ
نگار نے طنز کیا تھا کہ "لارڈ منٹو کی یادداشت

تمام ہندوستانی علوم کا نرتیہ ہے، اس میں ہندوستان
کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت
میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا۔
"انگریز یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہمیں
ہندوستان کی حکومت تو مل گئی ہے لیکن ہندوستانیوں
کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی - ان کو یہ بھی خیال
تھا کہ اگر ان علوم کی حمایت کی گئی جو اہل ہند
کو بہت عزیز ہیں تو وہ "ان کی نگاہوں میں
سرخرو ہو سکیں گے" اس لئے جنرل کمیٹی نے جو
تعلیمی پالیسی بنائی وہ مشرقی علوم کی حمایت میں
تھی - اس کے اراکین کچھ تو اپنے دامن کی تنگی کی
وجہ سے، اور کچھ عقیدۃً یہ سمجھتے تھے کہ مشرقی
تعلیم سوسائٹی کے اونچے طبقے سے شروع کی جائے
اور اس کے فوائد و برکات چھن کر طبقۂ ادنیٰ
تک پہنچنے چاہیئے - ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ
اس طبقے کو رفتہ رفتہ مغربی علوم سے اشناء کیا
جائے، اس لئے کہ اچھے نتائج مشرق و مغرب
کے امتزاج ہی سے مرتب ہو سکتے ہیں اور شاید

اسی صورت میں ان ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل
ہوسکتا ہے جو بعد میں ذریعہ تعلیم بنیں گی۔ دوسرے
ہندوستان جیسے قدیم اور وسیع ملک میں مغربی آگاہی
کی بنیاد صرف مشرقی علوم ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔" ۲۸

یہ بات قابل غور ہے کہ اٹھارویں صدی
کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں ہر
طرح سے مضبوطی حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان پر
حکمرانہ حیثیت حاصل کرنے کے بعد بھی ایسٹ انڈیا
کمپنی بہت دنوں تک کوئی تعلیمی پالیسی نہیں بنا
سکی لیکن بعد میں انھیں یہ ضرورت محسوس ہوئی
اور یہ ذمہ داری مشنریوں کے حصے آئی۔

ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعے جو
تعلیمی ادارے کھولے گئے ان میں پہلا اسکول ۱۷۸۰ء
میں کلکتہ میں آرکر (ARCHER) نامی شخص نے قائم کیا۔
اس کے بعد ۱۷۸۵ء میں جان اسٹرانسبرو (John
Stransberrow) نے مرزاپور میں ایک اسکول کھولا
جس میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو تعلیم دی جاتی
تھی۔ ان تمام نجی اداروں کے علاوہ کمپنی کی ایما پر

پر جو اسکول کھولا گیا وہ ۲۱ دسمبر ۱۷۸۹ء میں فری اسکول سوسائٹی آف بنگال کے نام سے قائم ہوا - اسکی نگرانی کا کام کمپنی کے پادریوں کو سونپا گیا جس میں چھ کمپنی گورنر بھی شامل تھے اور گورنر جنرل کی حیثیت سرپرست کی تھی - ۲۸ فروری ۱۷۹۰ء میں اسے چیریٹی اسکول سوسائٹی (Charity School Society) کے ساتھ جوڑ دیا گیا - ۱ اپریل ۱۷۹۰ء میں اس ادارے نے کلکتہ میں مفت تعلیم دینے کا فیصلہ کیا - اس میں سترہ لڑکے اور بارہ لڑکیاں اس وقت تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور دسمبر ۱۷۹۱ء تک ان کی تعداد پچاس لڑکے اور تیس لڑکیوں تک پہنچ گئی - ۹

ہندستانیوں کے درمیان تعلیم کا فروغ جو مشنریوں کے سپرد کیا گیا تھا، انکا بنیادی مقصد ہندستانیوں کے درمیان عیسائی مذہب کی تبلیغ تک محدود ہو گیا - ڈی - پی - سنہا کے مطابق ان میں سب سے اہم نام چارلس گرانٹ کا ہے جو ۱۷۶۷ء میں ہندستان آیا اور بنگال میں بورڈ آف ٹریڈ کا چوتھا ممبر بنایا گیا۔ [10] وہ پہلے جوا بازی (gambling)

کا شکار ہو گیا لیکن بعد کو اس نے ڈیوڈ براؤن سے
یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ عیسائی مذہب کے فروغ
کے لئے ہر ممکن کوشش کریگا۔ ۱۷۸۲ء میں گرانٹ
نے اس سلسلے میں ایک منصوبہ تیار کیا جسکی کاپیاں
لندن بھیجی گئیں۔ اسی دوران سوسائٹی فار پرموشن آف
کرسچین نالج کی کمیٹی نے کمپنی کو یہ تجویز بھیجی کہ جہاں جہاں
کمپنی کی حکومت ہے وہاں انگریزی اسکول قائم کئے جائیں۔
گرانٹ نے یہ تجویز رکھی کہ انگریزی کی جگہ فارسی کو بڑھاوا
دیا جائے کیونکہ اس کے ذریعے اپنے مقصد کو اور تیزی
کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکتا ہے لیکن برطانیہ کی پارلیامنٹ
نے یہ تجویز نامنظور کر دی۔ پھر بھی کارنوالس کے بعد
سر جان شورے جو گرانٹ کے خیالات سے متفق تھا اس
نے اس سلسلے میں بہت دلچسپی لی۔ شورے کے بعد جب
گورنر جنرل کا عہدہ ولزلی نے سنبھالا تو اس نے اس
مشن کو آگے بڑھایا۔ ایک کٹّر عیسائی ہونے کے باوجود
ولزلی ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے محسوس کیا کہ اب
کمپنی کا کام محض تجارت نہیں بلکہ ہندوستان پر حکومت بھی
کرنا ہے اور جس کے لئے ٹرینڈ افسروں (Trained Officers)

کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جو افسر ہندوستان
آتے ہیں وہ کم سن ہوتے ہیں اور ان میں عام معلومات
کی بھی کمی ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے کمپنی کے
افسروں کو باقاعدہ تعلیم (training) دینے کا ارادہ کیا
جو ہندوستان کے ماحول سے میل کھا سکے اور گلکرسٹ کا
تقرر اسی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ بنگال میں فورٹ ولیم کالج
کا قیام اور بعد میں کالج بند کرنے کے حکم سے ولزلی
چپ نہیں بیٹھا۔ فورٹ ولیم کالج کو بند کرنے کا حکم
یا اسکی مالی امداد کم کرنے کے حکم سے یہ بات صاف
ہو جاتی ہے کہ اس وقت کمپنی کے حکام کے درمیان
یہ مسئلہ بڑی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ ایک
طبقہ وہ تھا جو ہندوستانیوں کے بیچ کسی طرح کی
تعلیمی کوشش ہی کے خلاف تھا یا پھر ہندوستانی
زبان و ادب کے مطالعے کی کوئی ضرورت محسوس
نہیں کرتا تھا۔ دوسرا طبقہ کمپنی کے اقتدار کو
اور بھی مستحکم بنانے کے لئے ہندوستانیوں کی تعلیم پر
کافی زور دے رہا تھا۔ یہیں سے دو مکتبۂ فکر
مستشرقین (Orientalists) جو ہندوستانی زبان وادب

کی روشنی میں تعلیم دینے کی بات کرتے تھے۔ دوسرا طبقہ اینگلسسٹ (Anglicists) کا تھا جو اسکی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔

ہندوستان میں تعلیم کے سلسلے میں ابھی تک حکومت کی طرف سے کوئی باقاعدہ تعلیمی پالیسی وجود میں نہیں آئی تھی۔ تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ بھی کام ہو رہا تھا وہ یا تو کمپنی کے افسروں کی ٹریننگ یا مذہبی تبلیغ تک محدود تھا اور ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تھا۔ پہلی مرتبہ ۶ ستمبر ۱۸۱۳ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو پارلیامنٹ کی طرف سے گورنر جنرل کو یہ ہدایات دینے کا حکم ملا کہ ہندوستانیوں کے درمیان تعلیمی مسئلہ پر غور کیا جائے جس میں یہاں کے مقامی تعلیم یافتہ باشندوں کی حوصلہ افزائی و ادب کی فلاح و بہبود اور عوام میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا جائے۔ اس ضمن میں مختلف مقامات پر چل رہے اسکول اور دوسرے تعلیمی اداروں میں نئی قسم کی جدید تعلیم کا سلسلہ

شروع کرنے کی بات کی گئی۔ اسی بناء پر کچھ جگہوں پر ضلع اسکول کھولے گئے۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ، پٹنہ، مرشد آباد، بنارس، بریلی اور فرخ آباد میں تعلیمی کمیٹیاں وہاں کے مقامی افسروں کی نگرانی میں قائم کی گئیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ برطانیہ حکومت کی تعلیمی پالیسی میں صرف کرسچن مشنریوں کی مرضی ہی چلتی تھی، صحیح نہیں ہے۔ سر جارج بارلو (George Barlow) اس طرح کی حرکتوں کے سخت خلاف تھا اور اس کا خیال تھا کہ مشنریوں کی کارروائیاں ہندوستانیوں پر اچھا اثر نہیں چھوڑینگی۔ اس نے عام جگہوں پر مذہبی تبلیغ اور گاؤں میں جاکر مذہبی پرچے تقسیم کرنے پر پابندی لگا دی۔ ایسا نہیں تھا کہ سر جارج بارلو یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستانی مذہب تبدیل کریں یا عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ ہو بلکہ بارلو جیسے لوگوں کا خیال تھا کہ مذہب تبدیل کرنے کی مہم دھیرے دھیرے چلائی جانی چاہیئے تاکہ مذہب بدلنے والا پوری عقیدت کے ساتھ

عیسائی مذہب تسلیم کرے ۔[11]

بارلو کے بعد منٹو نے بھی وہی پالیسی
اپنائی اور ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب
اسے پتہ چلا کہ مشنریوں نے کوئی ایسا پرچہ فارسی میں
چھاپا ہے جو اسلام کی سخت تنقید کرتا ہے اور جس سے
مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں تو اس نے فوراً
اس پرچے پر پابندی لگا دی اور یہاں تک کہ مشنریوں
نے سیرام پور میں جو پریس قائم کیا تھا اسے کلکتہ منتقل
کرنے کا حکم دیا ۔

ان باتوں کے علاوہ ہندوستانیوں میں بھی
ایک ایسا طبقہ تھا جو محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستانیوں کی ترقی
محض کلاسیکی تعلیم سے ممکن نہیں بلکہ انہیں جدید علوم سے
روشناس کرانا ضروری ہے ۔ ان میں راجہ رام موہن رائے کا
نام بہت اہمیت رکھتا ہے ۔ راجہ رام موہن رائے نے
نہ صرف ایشیائی علوم بلکہ یورپی علوم کا بھی مطالعہ کیا اور
اپنے تعلیمی مشن کو جدید طریقوں سے ہندوستانیوں تک
لے جانے کی کوشش کی ۔ اسی زمانے میں ان کی
دوستی ڈیوڈ ہیئر (David Hare) سے ہوئی اور دونوں

نے مل کر سنہ ۱۸۱۵ء میں ایک اسکول کھولنے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلے کی ایک میٹنگ گورنر جنرل کے ساتھ طے ہوئی۔ کٹر ہندوؤں کے ایک گروہ نے راجہ موہن رائے کو اس ادارے سے منسلک ہونے کی سخت مخالفت کی اور بالآخر انھیں اپنا نام واپس لینا پڑا۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنا نام واپس لیا، گورنر جنرل کے ساتھ میٹنگ ہوئی اور اس طرح کی تعلیم دینے کا خیر مقدم کیا گیا جس میں کلکتہ کے بہت سے پڑھے لکھے ہندو حضرات شامل تھے۔ اس نوعیت کی تعلیم کے لئے کھولا گیا ادارہ اینگلو انڈین کالج بہت مقبول ہوا جسکی بنیاد ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۱۷ء کو رکھی گئی۔ اس اسکول کا بنیادی مقصد بنگالی اور انگریزی کی تعلیم کے علاوہ ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم جدید طریقوں سے دینا تھا۔

اینگلو انڈین کالج کے قیام کے باوجود راجہ رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیئر نے محسوس کیا مقامی زبانوں میں تعلیم دینا بہت ضروری ہے اور راجہ رادھا کانت دیو کو ساتھ لیکر کلکتہ اور اس کے آس پاس کچھ مقامی اسکول کھولے جو کلکتہ اسکول سوسائٹی کی نگرانی میں دے دئے گئے۔

اس کے علاوہ جے نرائن گھوشال نے ۱۸۱۷ء میں حکومت سے درخواست کی کہ بیس ہزار روپیوں کی امداد انھیں اس لئے دی جائے تاکہ ان روپیوں سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا جا سکے اور یہ تجویز جولائی ۱۸۱۸ء میں منظور کر لی گئی۔ ڈی کوری (Rev. D. Corrie) جو کلکتہ چرچ مشنری سوسائٹی سے منسلک تھا اسے اس ادارے کا نگراں بنایا گیا جس میں انگریزی، فارسی، ہندوستانی اور بنگالی کی تعلیم دی جانے لگی۔ ۱۸۲۵ء میں اس ادارے کو دی جانے والی رقم میں بیس ہزار کا اور اضافہ کر دیا گیا۔[۱۲]

اسی دوران مشنریوں پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ اٹھا لی گئیں جنکا مقصد تعلیم عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ ۱۸۱۵ء تک ان مشنریوں نے بنگال میں سو سے زیادہ ادارے کھول دیے تھے۔ اب تک انھوں نے بنگال میں ایک اخبار "سماچار درپن" بھی نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی حکومت نے یہ بھی محسوس کیا کہ اچھی تعلیم کے لئے مستند (qualified) اساتذہ کا ہونا ضروری ہے اور اس طرح اساتذہ کی ٹریننگ پر

بھی دھیان دیا گیا۔ ریورنڈ مے (Reverend May) جو
لندن مشنری سوسائٹی سے تعلق رکھتا تھا اور ہندوستان
میں اب تعلیم کے سلسلے میں نمایاں کام انجام دے رہا
تھا؟ اس نے دسمبر ۱۸۱۵ء کو اساتذہ کی ٹریننگ
کے لئے ایک اسکول کھولنے کی تجویز پیش کی جو
منظور کر لی گئی۔ ۱۸۱۷ء تک ایسے اسکولوں کی تعداد
تینتیس (۳۳) تک پہنچ چکی تھی جن میں دوسو چھبیس (۲۲۷) اساتذہ
اور دو ہزار پچاسی (۲۰۸۵) طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۳۱
اگست ۱۸۱۸ء میں مے کا انتقال ہوا اور
اب تک ایسے اسکولوں کی تعداد چھتیس (۳۶) تک پہنچ چکی
تھی جن میں تین ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔
۱۸۱۶ء میں چرچ مشنری سوسائٹی کے ایک رکن کیپٹن
اسٹیورٹ (Capt. Stewart) کی ایما پر بردوان اور اس
کے آس پاس کے علاقوں میں مقامی اسکول قائم کئے گئے
اور ۱۸۱۸ء تک ان میں ایک ہزار طلباء تعلیم حاصل کر
رہے تھے۔ یہ اسکول بہت مقبول ہوئے اور کلکتہ اسکول
سوسائٹی نے اپنا ایک ناظم ۱۸۱۹ء میں بردوان بھیجا تاکہ
وہ اسٹیورٹ کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کرے اور دیکھ کر

کم اساتذہ کے ذریعے زیادہ طلباء کو کیسے تعلیم دی جا سکتی
ہے جسکا خرچ دوسرے اسکولوں کی بنسبت آدھا آتا
ہے۔ ۱۸۲۲ء میں کرسچن نالج سوسائٹی نے سرکل سسٹم
(circle system) اسکول رائج کئے۔ شروع میں اس
کے تین حلقے ٹولی گنج، کاسی پور اور ہاوڑہ میں قائم
کئے گئے۔ ہر حلقے میں تین معاون اسکول (auxiliary
schools) تھے جو ایک مرکزی اسکول سے منسلک تھے
ناظم مشنری کے علاوہ اسکول میں ایک گرداور ایک سرکل
پنڈت ہوتا تھا جو ایک کے بعد دوسرے اسکول کا دورہ کرتے
تھے۔ ان اسکولوں میں الہامی کتابیں، قواعد، جغرافیہ
فطری فلسفہ و حساب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اسی زمانے میں مڈلٹن (Middleton) جو
کلکتہ کی سوسائٹی فار پروپگیشن آف دی گاسپل
(Society for promotion of the Gospel)
کا پہلا بشپ تھا، سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن نالج
کی مدد سے مشنری کالج کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اس
کالج کا مقصد یہاں کے مقامی لوگوں اور عیسائی نوجوانوں
کو گرجا کے اصول و ضوابط کی تربیت دینا تھا تاکہ

انھیں مذہبی تبلیغ کا کام سونپا جا سکے اور مذہبی عقائد کے مطابق اساتذہ تیار کئے جا سکیں۔ اس کالج کی بنیاد ۱۵ دسمبر ۱۸۲۰ء کو پڑی لیکن ۱۸۲۳ء میں مڈلٹن کی وفات تک کالج کی تعمیر کا کام مکمل نہ ہو سکا۔

اب تک جو اسکول کھولے جا رہے تھے ان کی نگرانی کے لئے کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی۔ ان کی نگرانی اور تعاون کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے مارشمین (Marshman) نے اس طرح کی تجویز پیش کی اور ۱۸۱۷ء میں کچھ ہندوستانی، یورپی اور مشنریوں کی کوششوں سے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی (Calcutta School Book Sciety) کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مقامی لوگوں میں تعلیم کے ذریعے اخلاقی اور علمی سمجھ پیدا کی جائے تھا۔

اس سوسائٹی کی انتظامی کمیٹی میں یورپی اور ہندوستانی ممبروں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ ۱۸۲۱ء تک اس سوسائٹی نے ایک لاکھ چھبیس ہزار چار سو چھیالیس کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کیں۔ اسی دوران کمیٹی نے محسوس کیا کہ اتنا بڑا کام بغیر حکومت کے تعاون کے ممکن نہیں، اس لئے حکومت سے امداد کی درخواست

کی گئی ۔ اس ضمن میں حکومت نے سوسائٹی کو پوری طرح سے امداد دینا منظور نہیں کیا لیکن فوری طور پر سات ہزار کی رقم اور پانچ سو روپیوں کی ماہانہ امداد دینے کا فیصلہ کیا ۔

اسکول بک سوسائٹی کی کامیابی اور تعلیم کے وسیع میدان کو مد نظر رکھتے ہوئے ۱۸۱۹ء میں کلکتہ اسکول سوسائٹی (Calcutta School Society) کا قیام عمل میں آیا جسکا مقصد کلکتہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اسکول قائم کرنا اور اس مقصد کے لئے اساتذہ تیار کرنا جو تعلیمی معیار کو برقرار رکھ سکیں ۔ اس سوسائٹی کی انتظامیہ کمیٹی تین اور ذیلی کمیٹیوں (Sub-Committees) پر مشتمل تھی ۔ پہلی ذیلی کمیٹی کا مقصد کچھ باقاعدہ اسکول کھولنا اور انہیں کامیابی کے ساتھ چلانا ، دوسری کمیٹی کا کام مقامی اسکولوں کا قیام اور مقصد کے لئے عوام میں دلچسپی پیدا کرنا تاکہ وہ خود پہل کریں اور تیسری کمیٹی کا کام کلکتہ میں انگریزی اور دوسرے اعلیٰ علوم میں تعلیم کا انتظام کرنا تھا ۔ سوسائٹی کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ اسی سال سوسائٹی نے تعلیم بالغاں اور تعلیم نسواں کی مہم چلانے کا ارادہ کیا ۔

سوسائٹی طلباء کو مقامی طور طریقوں پر تعلیم دیتی
تھی اور ہوشیار طلباء کو چن کر انہیں انگریزی اور اعلیٰ تعلیم
کے لیے سہولتیں مہیا کرتی تھی۔ ایک سال کے اندر ہی
اندر سوسائٹی کی نگرانی میں دو ہزار آٹھ سو طلباء تعلیم
حاصل کر رہے تھے۔ اسی سال سوسائٹی نے ایک انگریزی
اسکول کھولا جس میں ایسے طلباء کو داخلہ دیا جاتا تھا جو
بہت ذہین ہوتے تھے۔ اس طرح اس اسکول میں داخلہ پانا
قابلیت کی سند تھی۔ سوسائٹی کی مقبولیت کو دیکھتے
ہوئے کلکتہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چل
رہے بہت سے اسکولوں نے درخواست کی کہ سوسائٹی
انہیں اپنے الحاق میں لے لے۔ لیکن سوسائٹی نے یہ
درخواستیں نامنظور کر دیں کیونکہ پہلے وہ اس طریقے
کو مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد سوسائٹی
کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور حکومت سے مالی
امداد کی درخواست کی گئی جو حکومت نے منظور کر لی
اور سوسائٹی کو چھ ہزار روپئے سالانہ دینے کا فیصلہ کیا۔
سوسائٹی کی تعلیم نسواں کی مہم نے بہت
مقبولیت حاصل کی اور کلکتہ اسکول سوسائٹی نے ۱۸۲۰ء تک

ایسے پانچ باقاعدہ اسکول کھول دئے تھے۔ اسی زمانے میں
مشنریوں نے بھی تعلیم نسواں میں کافی دلچسپی لینی
شروع کر دی تھی اور کلکتہ میں نو عمر لڑکیوں کی سوسائٹی
(Calcutta Female Juvenile Society) نے اپنا
نام بدل کر مقامی عورتوں کی تعلیم کی سوسائٹی (Society
for Native Female Education) رکھ لیا۔ اس
طرح ۱۸۲۳ء تک بنگال میں لڑکیوں کے بائیس[22] اسکول
چل رہے تھے جن میں چار سو لڑکیاں تعلیم حاصل کر
رہی تھیں۔

ڈی۔ پی۔ سنہا کا خیال ہے کہ ابھی تک تعلیم
کا کام مشنریوں کے ہاتھ میں تھا جنکا پہلا مقصد ہندو مذہب
کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنا تھا جس سے عیسائیت کی راہیں
ہموار ہو سکیں۔[25] لیکن ان مقاصد کے باوجود
تعلیم کا مسئلہ اب صرف مشنریوں تک محدود نہ تھا
اور حکومت اصولی طور پر اس میں دلچسپی لینے لگی
تھی۔ برطانوی حکومت جو اب تک طرح طرح کی خانہ جنگی
کا مقابلہ کر رہی تھی اب ان جھگڑوں سے آزاد ہو چکی تھی
۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیامنٹ نے ہندوستان میں

تعلیم کے سلسلے میں جو قرارداد منظور کی تھی وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے اسے عملی شکل دینے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۱۱ء میں منٹو نے جو دو سنسکرت کالج کھولنے کی تجویز رکھی تھی اس پر پھر سے غور کیا گیا اور اور محسوس کیا گیا کہ سنسکرت کالج کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ طے پایا کہ اسی قسم کا ایک کالج کلکتہ میں کھولا جائے جسکا مقصد ہندوستانی علوم کے مطالعے کے ساتھ یورپی علوم کی تعلیم بھی دی جائے۔ اس سلسلے کی ایک تنظیمی کمیٹی بنائی گئی جسکا سکریٹری کرنل پرائس (Col. Price) کو بنایا گیا اور پچیس ہزار روپیوں کی سالانہ رقم کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار روپئے کالج کی تعمیر کے لئے منظور کئے گئے۔ لیکن اب تک حکومت کی باقاعدہ تعلیمی پالیسی سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر بھی جو تعلیم دی جارہی تھی وہ مشرقی طور طریقوں کو مد نظر رکھکر اور علاقائی اثرات کے علاوہ یہ بھی دھیان رکھا جاتا تھا کہ ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے ان کی دلچسپی بنی رہے۔ اس ضمن میں ان کی نفسیات اور جذبات کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

میکنزی (H. Mackenzie) کی تجویز تھی کہ اخلاقی اور علمی میدان میں ہندوستانیوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اس تجویز پر ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل نے غور کیا اور اس مسئلہ کو آگے بڑھانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی۔ لیکن کمیٹی کے تمام ممبر حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے اور ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ تعلیمی مسئلوں پر غور و فکر کر سکیں اس لئے ۱۸۲۳ء سے ۱۸۳۶ء تک کمیٹی کسی طرح کی پالیسی تیار نہ کر سکی۔ لیکن پھر بھی تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اب زیادہ تر لوگ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لئے انگریزی کی تعلیم ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ایک انگریزی کالج کھولنے کی تجویز پیش کی گئی اور انگریزی کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر انگریزی تعلیم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ۱۸۲۷ء سے کالج میں طبی کلاسیں (medical classes) شروع کر دی گئیں اور ۱۸۲۸ء میں طلباء کی عملی ٹریننگ کے لئے ایک اسپتال کھولنے کی تجویز رکھی گئی جسے فنڈ کی کمی کی وجہ سے حکومت نے نامنظور کر دیا۔

اب تک دہلی، آگرہ اور بنارس و ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بہت سے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے یا انھیں علاقائی زبانوں تک محدود رکھا جائے۔ حکمراں طبقے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو محسوس کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لئے انگریزی کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء کو ڈائرکٹرز نے ایک مراسلے میں یہ خواہش ظاہر کی کہ یہاں کے باشندوں میں انگریزی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔[۴۶]

ہندوستانیوں کی تعلیم کے سلسلے میں اہم موڑ ۱۸۳۵ء میں آتا ہے جب بنٹنک اور میکالے کے نظریات تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں سامنے آتے ہیں۔ بنٹنک بنیادی طور پر اصلاح پسند تھا اور اس نے ہندوستان آکر جو کارنامے انجام دئے وہ سبھی جانتے ہیں۔ بنٹنک نے کلکتہ پہنچنے کے بعد دو اہم کارنامے جو تعلیمی میدان میں انجام دئے وہ یہ کہ میڈیکل کالج کا قیام طور طریقوں کے مطابق (یعنی انگریزی ذریعہ تعلیم) اور ولیم آدم

کا تقرر کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ (William Adam) میں مقامی طور طریقوں سے تعلیم دینے کے لئے امکانات کی نشاندہی -

اسی زمانے میں بینٹک نے انگلو اورینٹل (-Anglo Oriental) اختلاف جو وجود میں آئے انھیں ختم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا - آدم کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم مقامی طور طریقوں پر دی جانی چاہئے لیکن میکالے اس کے سخت خلاف تھا - جب جنرل کمیٹی کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی تو یہ مسئلہ سپریم گورنمنٹ کے سپرد کر دیا گیا -

اس وقت تعلیمی پالیسی کو لیکر جو اختلافات زیر بحث تھے ان کی روشنی میں ۱۸۳۳ء میں جنرل کمیٹی نے یہ رائے دی کہ آگرہ کالج فنڈ کی بچی ہوئی رقم کو انگریزی تعلیم کے فروغ پر خرچ کیا جائے جو وہاں کی مقامی کمیٹی نے فوراً تسلیم کرلی اور مقامی کمیٹی کی گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے مشورہ دیا کہ کالج میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم ختم کر دی جائے کیونکہ اس سے وقت کی بربادی ہوتی ہے اور ایسی تعلیم پر جو وقت اور رقم خرچ ہوگی اسے انگریزی تعلیم

پر صرف کیا جائے - لیکن جنرل کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ
ایسے اقدامات اتنی جلدی نہیں اٹھانے دینے چاہیئے حالانکہ
جنرل کمیٹی کو آگرہ کمیٹی کی رپورٹ سے مکمل اختلاف
نہیں تھا - جنرل کمیٹی نے یہ رپورٹ حکومت کو بھیج دی
اور جواب میں حکومت مختلف تبدیلیوں کی توضیح
جاننا چاہتی تھی جس کی بناء پر جنرل کمیٹی نے مقامی کمیٹی
سے تفصیل مانگی - مقامی کمیٹی نے جواب میں لکھا کہ اب
تک کے تجربوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انگریزی
تعلیم کی سخت ضرورت ہے - مقامی ٹھاکر اور مالدار تاجر
اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے میں زیادہ دلچسپی
لے رہے ہیں بنسبت مقامی تعلیم کے - مقامی کمیٹی نے
انگریزی تعلیم کی مقبولیت کے ثبوت کے طور پر کوٹا
کے انگریزی اسکول کی مثال دی جو ہندوستانیوں نے
کھولا تھا اور کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں دعوی
کیا کہ انگریزی کی کتابوں کی فروخت دوسری زبانوں
کی کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے - اسی
بناء پر [illegible] کی تعلیم ختم کر دینے کی
تجویز پیش [illegible] جنرل کمیٹی نے غور کرنے کے لئے

حکومت کے حوالے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ آگرہ کالج کے مسئلے پر کوئی فیصلہ ہوتا یہ مسئلہ کہ کلکتہ مدرسے کو انگریزی ادارہ بنایا جائے اٹھ کھڑا ہوا۔ ۲۶ اپریل ۱۸۳۴ء کو مدرسے کی ذیلی کمیٹی (Sub-Committee) کی میٹنگ نے یہ تجویز پاس کی کہ وقت آ گیا ہے کہ اب کھل کر مدرسے میں انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اب انھیں طلباء کو وظیفہ (Scholarship) ملے گا جو عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کریں گے۔[۱]

اس میٹنگ میں ہرنسپ (H.T. Prinsep) جو مستشرق (Orientalist) کے گروہ میں شامل تھا اسے نہیں بلایا گیا۔ بعد میں اس نے بہت احتجاج کیا کہ ایسا ادارہ جو عربی زبان و ادب کی حوصلہ افزائی اور مشرقی علوم کو پھر سے زندہ کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا اسے انگریزی تعلیم کی درسگاہ میں تبدیل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس اقدام کو جلد بازی کا فیصلہ کہتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ یہ ان لوگوں کی سازش ہے جو کچھ دنوں بعد عربی زبان و ادب اور مشرقی علوم کو مردہ قرار دے کر ان کی تعلیم ختم کر دینا چاہیں گے۔ اس کمیٹی

کی میٹنگ میں شیکسپیر (Shakespear) موجود تھا۔ اس
نے اس بات سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ میٹنگ کے
وقت برڈ اور کالون (Bird and Colvin) کے
علاوہ اور کوئی ممبر کلکتہ میں موجود نہ تھا اور
دونوں میں سے کسی کو اس تجویز سے اختلاف نہ
تھا۔ لیکن مدرسے کے سالانہ امتحانات کے جو نتیجے
آئے ان سے اس تجویز کی ناکامی ثابت ہوئی کیونکہ
انگریزی کے نتیجے بہت خراب تھے۔ ان نتیجوں کا
شیکسپیر پر اثر پڑا اور اس نے یہ رائے دی کہ
یہ مسئلہ جنرل کمیٹی کے سامنے لے جایا جانا چاہئے۔
لیکن پھر بھی ان کے خیالات (شیکسپیر، کالون اور برڈ)
میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پرنسپ جو اس
کمیٹی میں تھا لیکن اپنی رائے کا اکیلا شخص تھا ان
لوگوں سے مسلسل اپنی اختلاف رائے کا اظہار کرتا
رہا۔ اس نے یہ بھی دلیل دی کہ ذیلی کمیٹی (Sub-Co-
mmittee) کو اپنی تجاویز جنرل کمیٹی کے سامنے پیش
کرنی چاہئیں اور ذیلی کمیٹی فیصلہ لینے کا کوئی حق نہیں
ہونا چاہئے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ پرنسپ ذیلی کمیٹی

کی اس تجویز سے اتفاق کرتا تھا کہ طلباء کو انگریزی کی تعلیم دی جانی چاہیے لیکن کالج میں انگریزی کی تعلیم کو لازمی بنا دینے کے سخت خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ویسی ہی بات ہوگی میڈیکل کی ڈگری حاصل کر رہے طالب علم سے اس بات کی توقع کی جائے کہ وہ ڈرائنگ کے استاد سے بھی سبق لے تاکہ فنون لطیفہ کا عالم ہو سکے۔ 19

بعد میں یہ مسئلہ جنرل کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جس میں شیکسپیئر اور پرنسپ کی کچھ مسئلوں پر مشترکہ رائے بھی شامل کی گئی اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں ایسی دلچسپی پیدا کی جائے کہ وہ انگریزی کی تعلیم حاصل کریں۔

جنرل کمیٹی نے تعلیمی پالیسی کو لیکر اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ کمیٹی میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دے رہے تھے جن میں شیکسپیئر شامل تھا اور اس طرح مستشرقین اقلیت میں آ گئے۔ بعد میں اس مسئلے پر بہت طویل بحث چلی اور اسی دوران شیکسپیئر نے

اپنا خیال بدل دیا اور مستشرقین میں شامل ہو گیا۔ اس طرح کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مستشرقین سے الگ ہو کر اینگلسسٹ (Anglicists) میں شامل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ووٹنگ (Voting) کے وقت دونوں مکتبۂ خیال کے لوگوں کی تعداد یکساں تھی۔[20]

بعد میں جنرل کمیٹی نے محسوس کیا کہ موجودہ تعلیمی پالیسی میں مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو گیا تھا اور مستشرقین (Orientalists) و اینگلسسٹ (Anglicists) کی لڑائی اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ فوراً کوئی فیصلہ لینا آسان بات نہ تھی۔ اینگلسسٹ اس بات کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور ذریعۂ تعلیم انگریزی کو قرار دیا جانا چاہئے۔ لیکن مستشرقین انگریزی کی تعلیم کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کو جو بھی تعلیم دی جائے وہ ان کی مقامی زبانوں کے ذریعے دی جائے انھیں سمجھنے میں دقت نہ ہو۔[21]

یہی نہیں بلکہ اینگلسسٹ (Anglicists) کا
یہ بھی کہنا تھا کہ حکومت کا فرض ہے کہ ہندوستانیوں
کے بیکار کے جذبات کے ڈر سے خاموش نہ بیٹھے
بلکہ حکومت کو کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے (برطانوی)
خیالات ان پر اثر انداز ہوں اور ہم انھیں حقیقت
سے آگاہ کرائیں۔ ہندوستانیوں کو حقیقت سے تبھی
روشناس کرایا جاسکتا ہے جب ہندوستانیوں کو اس بات
پر آمادہ کیا جائے کہ وہ یورپی کلچر کو باقاعدہ تسلیم
کریں۔ لیکن اینگلسسٹ ہندوستان کی تمام قدیم روایات
کو مردہ سمجھتے تھے اور ان روایات کے بنے رہنے کی کوئی
ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ مستشرقین کا کہنا
تھا کہ ہندوستانیوں کو پورا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنے
ادب اور کلچر کا مطالعہ کرسکیں اور اس کے لئے انھیں
ہر طرح کی آسانیاں مہیا کی جانی چاہئیں۔ جہاں تک
یورپی حقائق کا تعلق ہے مستشرقین کا خیال تھا کہ
اگر یورپی کلچر میں اتنی طاقت ہے یہ حقائق ہندوستانیوں
پر خود بخود اثر انداز ہوں گے۔

زبان کے مسئلے پر بھی اینگلسسٹ

کا کہنا تھا کہ انگریزی ادب اور سائنس کی سمجھ ہندوستانیوں
میں ان کی زبانوں میں ترجموں کے ذریعے بیکار
ثابت ہوگی۔ انھوں نے اس کی دو وجہیں پیش کیں۔
اول تو یہ کہ ترجموں کے کورس کا باقاعدہ انتظام
بہت مشکل کام ہے۔ دوسرے یہ کہ ترجموں کے ذریعے
اصل مقصد کی ترسیل ممکن نہیں ہو سکتی ۔ مستشرقین
کا کہنا تھا کہ ہندوستانیوں کو ان کے ادبی سرمائے
سے الگ کر کے ان انگریزی ادب سے وہ انگریزی
نہیں سیکھ سکتے ۔

اینگلسسٹ نے سفارش کی کہ سرکاری
رقم کو ایسے کاموں میں نہیں لگایا جانا چاہئے جو بیکار
ہوں اور اسکی مثال انھوں نے مستشرقین کے ذریعے پیش
کی ہوئی تعلیمی پالیسی سے دیا۔ لیکن مستشرقین کا
خیال تھا کہ ہندوستانی علم و ادب کا برقرار رکھنا اور اس کی
حوصلہ افزائی کرنا برطانوی حکومت کا فرض ہے۔ اس لئے
کہ ان کاموں کے ذریعے ہندوستانیوں کی حمایت حاصل
کی جا سکتی ہے ۔

اسی زمانے میں میکالے کونسل آف

ایجوکیشن (Council of Education) کا صدر بنایا گیا جس نے انگلسسٹ نے خیالات کی وکالت کی اور اس نے مستشرقین کی دلائل کو سرے سے رد کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور عرب کا تمام ادبی سرمایہ بھی ایک اچھے یورپی کتب خانے کے ایک حصے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا ہے ۲۲ ۔ اس کے مطابق اسکا یہ مشاہدہ سنسکرت اور عربی ادب کے مترجم کارناموں کے مطالعے کی بناء پر تھا۔ اسکا خیال تھا کہ موجود ہندوستان میں ہندوستانیوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی اور اس طرح انھیں کسی غیر ملکی زبان یعنی انگریزی کے ذریعے ہی تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے بارے میں اسکا یہ بھی خیال تھا کہ انھیں تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ایسے لوگ جو انگریزی تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے وہ ایک طرح سے تعلیم ہی سے نفرت کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ جو لوگ جو سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان پر حکومت کو اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور دوسری طرف انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے اپنا خرچ خود

اٹھانے کو تیار ہو گئے

مستشرقین کی مخالفت کرتے ہوئے

اس نے یہ بھی کہا کہ حکومت نے اب تک ایک لاکھ روپے کی کتابیں مقامی زبانوں میں چھاپی ہیں لیکن عملی طور پر یہ ساری کتابیں بیکار پڑی ہوئی ہیں اور ان کتابوں کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف انگریزی کی کتابیں ایک سال میں آٹھ ہزار فروخت ہوئی ہیں جن سے نہ صرف چھپائی کی لاگت نکل آتی ہے بلکہ بیس فیصد فائدہ بھی ہوتا ہے۔

مستشرقین کا یہ خیال کہ قانون کے افسروں (Law Officers) کی ٹریننگ کے لئے اورینٹل کالج (Oriental College) ضروری ہے، میکالے نے کہا کہ لا کمیشن (Law Commission) کا کام ختم ہونے کے بعد کالج ختم کرنا پڑیگا جس پر بہت زیادہ خرچ آئے گا جو مناسب نہیں۔ ہندوستان کے مقدس ادبی سرمائے جو عربی اور سنسکرت میں ہیں ان کے مطالعے کے سلسلے میں اس نے کہا کہ ہمیں اس معاملے میں غیر جانبدار رہنا چاہئے۔ اس نے اپنی بات منوانے کے لئے یہ

بھی کہا کہ ہمیں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے بھی
ہندوستانیوں کے درمیان کچھ نہیں کرنا چاہئے۔

تعلیم کے سلسلے میں میکالے کا رویہ بالکل
تاجرانہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں میں تعلیم کی
صرف اتنی ضرورت ہے کہ کچھ ایسے لوگ تیار کئے جا
سکیں جو ہندوستانیوں اور حکمرانوں کے درمیان اظہار و
ترسیل کا کام کر سکیں۔ ایسا طبقہ جو رنگ و روپ میں
تو ہندوستانی ہو لیکن عادتیں انگریزی ہوں" ۱۲؎

میکالے کی تعلیمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے
خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں یہ بحث
چل رہی تھی کہ ہندوستانیوں کو کون سی تعلیم دی جائے
اور اس کا ذریعہ کیا ہو۔ لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ
ہندوستانی کلچر خرافات اور توہمات کا پشتارہ ہے اور
وہ تاریخ جو تیس فٹ کے اونچے حکمرانوں سے بھری
ہوئی ہے اور جن کا دور حکومت تیس ہزار سال تک
پھیلا ہوا ہے اور وہ جغرافیہ، جس میں تمام سمندر،
دودھ اور شیرے کے ہیں، ان کا پڑھانا محض تضیع
اوقات ہے۔ میکالے Cecil Rhodes کا ہم نوا اور

ہم خیال تھا۔ ان دونوں کو برطانیہ کی مسیحائی کا یقین تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اس فیوض و برکات ہی سے یہ خدا کی مقہور اور تیرہ و تار سرزمین روشن ہو سکتی ہے۔ میکالے کے فکری محرکات میں برطانوی سرمایہ داری کی وہ سیاسی اور معاشی ضرورتیں اور مصلحتیں مستزاد تھیں جنکا تقاضا تھا کہ ملک میں ہمدرد اہل کاروں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو نوآبادیاتی نظام کے قیام میں اعانت کر سکے۔" جو خون اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز" میکالے کو یہ بھی یقین تھا کہ اگر اس کی تعلیمی پالیسی پر عمل کیا گیا تو اس سے ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور انگریزوں کی لسانی، علمی اور مذہبی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا۔

میکالے کی یہ تعلیمی یاد داشت (۱۸۳۵ء) ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس موقع پر ولسن (Wilson) نے بہت واویلا مچائی کہ یہ بڑا ظلم ہے کہ ہندوستانیوں کے ذہن کو ان کی تہذیبی بنیادوں سے محروم کر دیا جائے اور وہ اپنے فکر و خیال کے لئے ایک

اجنبی ملک کے محتاج ہو جائیں جو سات سمندر پار واقع ہے۔ لیکن گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے اس یادداشت کو منظور فرمالیا۔ مشرقی علوم کے حمایتیوں کو شکست ہوئی اور ہندوستان کی ثقافتی غلامی کا وہ دور شروع ہوا جو فوجی محکومی سے زیادہ گراں نشیں تھا۔ [25]

صرف یہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ دہلی اور بنارس کو چھوڑ کر جہاں بھی مقامی تعلیم حاصل کرنے کے ادارے ہیں انھیں بند کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس کی تجاویز نامنظور کر دی گئیں تو وہ اپنے عہدے سے استعفی دے دے گا۔ حالانکہ بنٹنک نے میکالے کی رائے سے اتفاق کیا لیکن اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کیونکہ پرنسپ اپنے خیالات کی مخالفت پر اٹل تھا اور بحث جاری تھی۔ پرنسپ نے کہا کہ میکالے نے تعلیم کے تمام نشیب و فراز کو سمجھے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی میکالے میں ادبی سمجھ کی گہرائی نہیں ہے اور رائے دی کہ اس سفارش کو منظور نہ کیا جائے۔ پرنسپ نے اس نظریے کو بھی چیلنج

کیا کہ ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی اُمنگ ہے۔ انگریزی کتابوں کی فروخت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اول تو انگریزی کتابیں سستی ہوتی ہیں دوسرے یہ کہ بہت سی کتابیں عیسائی لوگ اور ان کے علاوہ مشنری اسکول خرید لیتے ہیں۔

ان مباحث کی روشنی میں ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے جو فیصلہ سنایا وہ اینگلسسٹ کے حق میں تھا جس میں کہا گیا کہ :

۱۔ برطانوی حکومت کا مقصد یورپی ادب و سائنس کی فلاح و بہبود ہونا چاہیے اس لئے زیادہ سے زیادہ رقم انگریزی کی تعلیم کی طرف منتقل کر دی جائے۔

۲۔ مقامی علوم کی تعلیم کے لئے کھولے گئے کالج و اسکول بند نہ کئے جائیں اور تمام اساتذہ و طلباء کو جو سہولتیں ملتی رہی ہیں انھیں جاری رکھا جائے۔

ساتھ ہی گورنر جنرل نے تعلیم کے دوران طلباء کی مالی امداد سے ناخوشی کا اظہار کیا۔

۳۔ مقامی زبانوں میں کتابوں کی
چھپائی کے لئے جو رقم منظور کی گئی
تھی، جتنی کتابیں چھپ گئی ہیں، ان
کے بعد کی چھپائی فوراً روک دی جائے۔
۴۔ اس تعلیمی پالیسی کو عمل میں لانے
سے جو رقم بچے اسے ہندوستانیوں پر
انگریزی ادب و سائنس کی تعلیم انگریزی
زبان کے ذریعے دی جائے۔ [۲۶]

اس فیصلے کے بعد مستشرقین خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اپنی مہم جاری رکھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو بھی بیدار کرنے کی کوشش کی اور حکومت سے درخواست کی کہ گورنر جنرل کے فیصلے پر پھر سے غور کیا جائے۔ اب تک بنٹنک اور میکالے کی تعلیمی پالیسی کے تجربے کئی جگہ ہو چکے تھے اور اس پالیسی کی ناکامی حکومت پر عیاں ہو چکی تھی۔ ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو لارڈ آک لینڈ (Lord Auckland) نے اس پالیسی کو رد کر دیا اور حکومت نے اعلان کیا کہ وہ مدرسوں پر میکالے کی سرپرستی

سے قبل ملتی رہی ہیں پورے جاری کر دی جائیں گی۔
اس ضمن میں آک لینڈ (Auckland) نے درمیانی راستہ
اپنایا جس سے شیکسپیئر اور پرنسپ دونوں اتفاق کرتے
تھے کہ انگریزی اور مقامی دونوں قسم کے تعلیمی ادارے
چلائے جائیں جن یورپی ادب اور سائنس کو دھیرے
دھیرے بڑھاوا دیا جائے اور کوئی چیز طلباء پر زبردستی
ٹھونس نہ جائے۔

آک لینڈ نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں
کے لئے باقاعدہ تعلیمی پالیسی کا ہونا ضروری ہے اور اس
طرح اس نے جنرل کمیٹی کو ہدایات دیں کہ اس سلسلے
میں رپورٹ تیار کرے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۰ء کو آک لینڈ
کی تجاویز و سفارشات کی روشنی میں جو رپورٹ تیار کی
گئی اس میں محسوس کیا گیا کہ اخلاقیات، سیاست،
معاشیات اور قانون کے لئے قابل پروفیسروں کا ہونا
ضروری ہے کیونکہ اب تک ایسی تعلیم پر کوئی خاص توجہ
نہیں کی گئی اور فی الحال یہ کورس اینگلو انڈین کالج (یا
ہندو کالج) تک محدود کر دیے جائیں۔ ساتھ ہی تعلیم کو
مقبول بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ اسکالرشپ کا

انتظام کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ایک تعلیمی ادارے کا رابطہ دوسرے تعلیمی اداروں سے ہونا چاہئے اور یورپی علوم کی کتابوں کے تراجم مقامی زبانوں میں ہونے چاہئیں تاکہ ہندوستانیوں کو ان علوم سے روشناس کرایا جا سکے۔ تعلیمی اداروں کی نگرانی کے لئے انسپکٹر آف اسکول اور کالج (Inspectors of Schools and Colleges) کا تقرر ہونا چاہئے جو جون ۱۸۵۵ء میں عمل میں آیا۔ انسپکٹر کی مندرجہ ذمہ داریاں ہوتی تھیں:

۱۔ ایسے ذرائع فراہم کرے کہ انگریزی کی تعلیم (Govt. Seminaries) سرکاری سمنریز میں دی جا سکے۔

۲۔ مقامی بولیوں کی سمجھ پر زور دیا جائے تاکہ طلباء و اساتذہ میں ایک دوسرے کو سمجھنے کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔

۳۔ ضلع سطح پر تعلیمی ادارے کھولے جائیں جن میں مقامی تعلیم دی جا سکے۔

۴۔ مقامی تعلیم کے لئے تیاری اور ان کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔

۵۔ اور ہر جگہ با قاعدہ اور یکساں طریقۂ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۸۴۲-۴۳ء میں کونسل آف ایجوکیشن (Council of Education) نے حکومت سے درخواست کی کہ تعلیم کو سائنٹفک بنانے کے لئے سوئٹزرلینڈ (Switzerland) اور انگلینڈ (England) کی طرح نارمل اسکول کھولے جائیں اور یہ اسکول کھلنے سے پہلے دوسرے اسکولوں سے مشورہ ضرور کیا جائے۔

دوسرے سال ایجوکیشنل کونسل نے نارمل اسکول کھولنے کے ساتھ فطری فلسفہ (Natural Philosophy) کی سیٹ اور شعبۂ تعمیرات (Deptt. of Architecture) کھولنے کی بھی سفارش کی جسے ہندو کالج سے جوڑ دینے کا مشورہ دیا گیا اور جہاں اساتذہ کو ٹریننگ دی جا سکے۔ کونسل نے یہ بھی سفارش کی کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کے کچھ علاقوں میں یونیورسٹیاں کھولی جائیں جو حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۴ء میں تسلیم کر لیا اور کلکتہ، بمبئی و مدراس میں لندن یونیورسٹی کی طرز پر

یونیورسٹیاں کمیشن کا قلم جاری کیا۔

1 A. J. Arberry — British Orientalists — Page: 7
Publisher: William Collins of London — 1943

"— — — so that in this no man's land or, rather, everyman's land the orientalist joins forces with the archaeologist, the historian, the etymologist, the the phonetician, the philosopher, the theologian, the musician and the artist."

2 Ibid — Page: 8

"If the judgement were true, the clearly we must deplore the time and energy wasted by our brilliant but misguided countrymen who have taken pride in their Orientalism. But it is, of course, a partly malicious

and, one fears wholly ignorant misrepresentation of the facts". -

[illegible] RHYS DAVIS – Buddhist Birth Stories, I, XIII

[illegible] G. T. GARRATT – Legacy of India – Page: 27
(India in European Literature by H.G. Rawlinson)
Oxford University Press, London – 1938

[illegible] Ibid Page: 27

"Like jewel among pebbles, sapphire among jewels, is the excelence of the Marathi tongue. Like the jasmine among blossoms, the : [illegible] among perfumes, the peacock among birds, the Zodiac among the stars, is Marathi among languages." -

[illegible] Ibid Page – 28

[illegible] Ibid

"They chose
The figtree, not that kind for fruit renowned,

– contd.

But such as, at this day to Indian known,
In Malabar or Deccan spreads her arms,
Branching so broad and long, that in the ground
The bended twigs take root, and daughters grow
About the mother tree a pillared shade,
High over-arched, with echoing walks between;
There oft the Indian herdsman, shunning heat,
Shelters in cool, and tends his pasturing herds
At loop-holes, cut through thickest shade."

۸ صدیق الرحمٰن قدوائی — ماسٹر رام چندر
(مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی — ص۔ ۱۵-۱۷)
ناشر: شعبۂ اردو — دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء —

۹ Hyde : Parochial Annals of Bengal — Page : 239

۱۰ D. P. Sinha : The Educational Policy of the East India Company in Bengal to 1854 — Page: 4
( Punthi Pustak, Calcutta — 1964 )

۱۱ Ibid Page : 19
"Conversions, they believed, must necess-

—contd.

arily be slow; "arising more from a conviction of the principles of our religion itself and from the pious example of the teachers" rather than from any interference of the State."

cit S. Mahmud – English Education in India Page: 26

cit D. P. Sinha: The Educational Policy of the East Indian Company in Bengal to 1854 Page: 42

cit Ibid Page: 44.

"--- to promote "the moral and intellectual improvements of the Natives by diffusion among them of useful elementary knowledge."

cit Ibid Page: 47

"Thus the period between 1813 and 1821 saw the first signs of a widespread attempt to disseminate education among Indians and to acquaint

— contd.

with a knowledge of English language and literature. Hitherto educational activities had been confined to the Missionaries alone and they had been actuated simply by a desire to destroy the foundations of Hinduism and to prepare the way for the reception of Christianity."

d14 Public Dispatch – 29th Sept 1830

(National Archives, New Delhi)

"It is of the greatest importance that to these and others of the native youths, the means should be afforded of cultivating the English language and literature and aquiring a knowledge of European science and familiarity with European ideas, in a higher degree than has yet been within their power."

21. D. P. Sinha: The Educational Policy of the East-India Company to 1854
Page: 180-81

"The Committee, being of the opinion that the time had arrived for encouraging openly and decidedly the study of English in the Madrassa. Resolved that from the present date no student be elected to a scholorship unless on the express condition of studying English as well as Arabic."

21 Home, Public 30th July, 1834
(National Archives of India)

"--- the endowment took place nearly half a century ago, since which things have greatly changed, and it
-contd.

now appears to me that it is incumbent on us for the welfare of the Mohammedan students themselves to do all we can to prevail on them to qualify in English as well as in Arabic, for most assuredly the time is approaching when their Law and Arabic literature will be of little use to them without it."

d[19] Ibid 15th Aug. 1834

"--- as if it were to be made a rule to refuse a degree to a student of medicine unless he attended the drawing master's lessons, the laudable purpose being to encourage -- of right principles and independent minds, will be confined exclusively to the fawning, flattering sycophants

— contd.

who put their names down to the English class in order to carry favour with the powers that be."

er' D.P. Sinha: The Educational Policy of the East India Company to 1854. Page-184

"--- but Shakespear soon changed sides and as the debates dragged on there were further defections on both sides, until when the voting took place there was a tie."

er' Ibid Page. 184

"The Anglicists asserted "the paramount value and obligation of communicating direct instruction in English literature and science in the seminaries of higher education. --- The orientalists professed their appreciation of "the importance of creating a taste

—Contd.

for English science and literature among the Natives," which they hoped could not but "contribute to a wider diffusion of European knowledge in the vernacular dialects."

ح۲۲ Macaulay Minute

(India Office Library, London)

"--- a single shelf of good European library was worth the whole Native literature of India and Arabia."

ح۲۳ "--- the people of India do not require to be paid for eating rice when they are hungry."

ح۲۴ Ibid

"We must at present do our best to form a class who may be interpreter between us and the millions

—contd.

whom we govern, a class of persons Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, in morals and intellect. To that class we may leave it to refine the vernacular dialects of the Country, to enrich those dialects with terms of science borrowed from the Western nomenclature and to render them by degrees fit vehicles for conveying knowledge to the great mass of the population

۲۵ح صدیق الرحمٰن قدوائی — ماسٹر رام چندر

ص: ۲۲-۲۳

۲۶ح Home - Public — Resolution — 7th March 1835

(National Archives of India)

۲۷ح

—

# سر ولیم جونس

جونس کی تعلیمی ابتداء علم ریاضی سے ہوئی۔ اس میں بچپن سے ہی ادبی ذوق نمایاں نظر آتا ہے۔ اس نے بہت ہی کم عمری میں ہی نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔

۱۷۶۴ء میں جونس نے یونیورسٹی کالج آکسفورڈ میں داخلہ لیا جہاں دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی مشرقی ادبیات میں بھی پیدا ہوئی۔ اس نے یہیں عربی سیکھنی شروع کی۔ اس نے تمام یونانی شعراء اور تاریخ دانوں کی تخلیقات اور افلاطون و لیوسی (Lucian) کے کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان پر تنقیدی نوٹ تیار کئے۔ اسی دوران اس نے مرزا نامی ایک شخص کو نوکر رکھا جس کے ساتھ مل کر عربی کے ترجمے کئے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ عربی اور فارسی ایک دوسرے سے کتنا قریب ہیں۔ اس طرح اس نے سعدی کی گلستاں کا گہرا مطالعہ

کیا۔ گھر پر قیام کے دوران اس نے اطالوی، اسپینی اور پرتگالی کا بھی مطالعہ کیا۔ ۱۷۶۶ء میں گریفٹن نے ڈیوک کی طرف سے مشرقی زبانوں کے مترجم (Interpreter) کی پیش کش ہوئی جسے اس نے خندہ پیشانی سے نامنظور کر دیا۔

C. Reviczki اپریل ۱۷۶۸ء میں کو ایک خط میں حافظ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی شاعری کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے ہر مرتبہ ایک نیا خیال ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حافظ کی شاعری کے ترجموں اور ان کی اشاعت کی دقت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ انھیں ویسی منظوم شکل دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اس نے اپنے بہت سے خطوط میں عربی اور فارسی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اور اکثر لکھا ہے کہ اگر اس نے مشرقی ادب کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو بہت بڑے ادبی سرمائے سے محروم رہ جاتا۔

مشرقی ادب کی اسی دلچسپی نے جونس کو ہندوستان کی طرف کھینچا اور ستمبر ۱۷۸۳ء میں سپریم کورٹ

کے جج کی حیثیت سے کلکتہ وارد ہوا۔

ہندوستان آنے کے بعد اپنے ایک

دوست کو خط میں یہاں کے ماحول اور لوگوں کا ذکر

کرتے ہوئے ہندوستانی زبانوں کو سیکھنے کی دلچسپی کا

ذکر کرتا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت زین الدین

نامی ایک بزرگ، جو شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے، کو

مقرر کیا۔ ان کی شاعری کے ترجمے وہ اکثر اپنے دوستوں

کو بھیجا کرتا تھا۔

زبان کے اوجِ کمال میں ہی جونس نے ہندوستانی اور دیگر مشرقی

نوادرات کا مطالعہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس سلسلے

میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے سنسکرت

پر عبور حاصل کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ اسی زمانے میں

(ستمبر ۱۷۸۶ء) اس نے سنسکرت کی کئی تخلیقات کا ترجمہ

کیا ۔۔۔ مندرجہ ذیل موضوعات جن پر وہ کام کرنا چاہتا

تھا اور جو اس کی وفات کے بعد اس کے کاغذات میں ملے

وہ یوں ہیں!

India

1. The Ancient Geography of India

2. A Botanical Description of Indian Plants from the Coshas
3. A Grammar of the Sanscrit Language from Panini
4. Dictionary of the Sanscrit Language from thirty-two original vocabularies and Niructi
5. On the Ancient music of the Indians
6. On the medical Substances of India and the Indian Art of Medicine
7. On the Philosophy of Ancient Indians
8. A Translation of Veda
9. On the Ancient Indian Geometry, Astronomy and Algebra
10. Translation of the Puranas
11. Translation of the Mahabharata and Ramay[illegible]
12. On the [illegible] Theatre.

13. On the Indian Constellations, with their Mythology from the Puranas

14. The History of India before the Mohammedan conquest the Sanscrit Cashmir Histories

اس کے علاوہ عرب، ایران، چین
اور آثار سے متعلق نو مزید موضوعات ہیں جن پر
وہ کام کرنا چاہتا تھا ـــــ اس کا خیال کہ ہندوؤں کا ادبی
ذوق بلند ہے اور وہ شاعری کو ایک devine art تصور
کرتے ہیں۔ اس نے تقریباً تمام ان تخلیقات کا مطالعہ
کیا جو ہندو مذہبی عقائد سے متعلق تھیں ـ ان
تخلیقات کا مطالعہ اس نے ہندوستانی کلچر کو مدنظر رکھتے
ہوئے کیا اور ان کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا۔
جونس نے بہت سی تخلیقات کا
ترجمہ بھی کیا جن میں درگا، بھوانی، اندرا، سوریہ،
لکشمی، نرائن، سرسوتی اور گنگا سے عقیدت کا اظہار
پیراکرت میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہندو سماج میں ان
کی اہمیت اور رسم و رواج کا تفصیلی ذکر بھی کیا

تاکہ یورپ سے لوگ یہاں کے کلچر اور رسم و رواج کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس نے رامائن، وید اور گیتا کا ترجمہ بھی کیا۔ ان میں گایتری منتر اور کالی داس کا ترجمہ کافی اہم ہے۔

گو کہ جونس جدید ہندوستانی زبانوں کے ضمن میں بہت زیادہ کام نہیں کر سکا اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں بھی جو دلچسپی کے موضوع ہو سکتے تھے وہ عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندو مذہبی عقائد سے متعلق چیزیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن جونس پہلا شخص ہے جس نے تمام ایشیائی زبان و ادب کا مطالعہ کیا اور ثابت کیا کہ تمام ایشیائی زبانوں کا ماخذ سنسکرت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مخطوطے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو دئے ان سے اس کی دلچسپی اور قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ ان مخطوطات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ مہابھارت (دو نسخے) ۔ سنسکرت

۲۔ رامائن

الف ۔ بالمیکی کی رامائن دیوناگری رسم خط میں

ب ۔ بالمیکی کی رامائن بنگالی رسم خط میں

ج ۔ بالمیکی کی رامائن دیوناگری رسم خط میں جو نامکمل ہے ۔

۳۔

الف ۔ سری بھگوت ۔ دیوناگری رسم خط میں جس کا ترجمہ تامل، فرانسیسی اور فارسی میں ہے اور بارہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔

ب ۔ سری بھگوت کی دوسری کاپی جو بنگالی رسم خط میں ہے

ج ۔ پتوں پر لکھی ہوئی کاپی جو بنگالی رسم خط میں ہے ۔

۴ ۔

اگنی پران جو بنگالی رسم خط میں ہے

۵ ۔

گاکی پران جو بنگالی رسم خط میں ہے

۶ ۔

الف ۔ واو پران جو دیوناگری رسم خط میں ہے ۔

ب ۔ یہ بھی اس کی دوسری کاپی ہے جو دیوناگری رسم خط
میں ہے ۔

۷ ۔

وریہد نارد پران جو بنگالی رسم خط میں
ہے ۔

۸ ۔ نارد پران جو دیوناگری رسم خط میں ہے

۹ ۔

الف ۔ بھوشیوتر پران جو دیوناگری رسم خط
میں ہے ۔

ب ۔ اس کی دوسری کاپی جو فہرست کے
ساتھ دیوناگری رسم خط میں ہے

۱۰ ۔

گیتا گوبند جو بنگالی رسم خط میں ہے ۔

۱۱ ۔

الف ۔ کمار سمبھو جو دیوناگری رسم خط میں
ہے ۔

ب ۔ دوسری کاپی بنگالی رسم خط میں ہے

۱۲ ۔ شتادھ جو بنگالی رسم خط میں ہے ۔

۱۳۔ بھٹی (Bhatti) جو بنگالی رسم خط میں ہے۔

۱۴۔

رگھوونش ۔ دیوناگری رسم خط میں

۱۵۔ وریت کتھا ۔ دیوناگری رسم خط

۱۶۔ سنگھاسن ۔ دیوناگر رسم خط میں

۱۷۔ کتھا سرت ساگر ۔ دیوناگری رسم خط

۱۸۔ سک سپتاپی ۔ دیوناگری رسم خط

جونس کے مطابق فارسی میں طوطی

نامہ اسی سے مستعار ہے۔

۱۹۔ رس منجری ۔ دیوناگری رسم خط میں

۲۰۔ شانتی ستک جو بنگالی رسم خط میں ہے

۲۱۔ ارجن گیتا جو دیوناگری رسم خط میں ہے

۲۲۔ ہتوپدیش جو بنگالی رسم خط میں ہے

۲۳۔ برہمہ نروپن ۔ دیوناگری رسم خط میں

۲۴۔ مالتی دوت ۔ بنگالی رسم خط میں

۲۵۔ تنتر سار ۔ بنگالی رسم خط میں

۲۶۔ سہرنامہ ۔ دیوناگری رسم خط میں

۲۷۔ کیرتا رجنیہ ۔ بنگالی رسم خط میں

۲۸ – سدھانت سرومنی – دیوناگری رسم خط

۲۹ – سنگیت نارائن — دیوناگری

۳۰ – ورہدرا نانکا (Vrihadaranayca) دیوناگری

۳۱ – نرکتی — دیوناگری

۳۲ – ماگوٹیکا – دیوناگری

۳۳ – چنداس – دیوناگری

۳۴ – راج بلبھ — بنگالی

۳۵ – پٹھ پردیپ – بنگالی

۳۶ – .

الف – مانودھرم ساستر – دیوناگری

ب – دوسرا کابی دیوناگری

۳۷ – مگدھ بودھ ٹیکا – بنگالی ر

۳۸ – سرسوتی ویاکرن — دیوناگری :

۳۹ سرسوتی — بنگالی

۴۰ – سدھانت چندری – دیوناگری

۴۱ –

الف – امرکوس — دیوناگری

ب – " "

ج – " بنگالی

۴۲ - میدنی کوس — دیوناگری

۴۳ - وِدو ہرکاس کوس — دیوناگری

۴۴ - سبدشبدرکلپ - شرو - (دو جلدیں) دیوناگری

۴۵ - وینی سمہارا — بنگالی

۴۶ - مہاناٹک — بنگالی

۴۷ - شکوشلا (جونس نے اسے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا) بنگالی

۴۸ - مالتی اور مادھو — بنگالی

۴۹ - نیشادھ — بنگالی

۵۰ - کولکا سروسوم — بنگالی

۵۱ - چندر ابھشیکا — بنگالی

۵۲ - رتناولی — بنگالی

۵۳ - وکرم اور سوی — بنگالی

۵۴ - مالوک آگنی مترا — بنگالی

۵۵ - سنسکرت اثاروں کا ایک کیٹلاگ - دیوناگری

۵۶ - گیتا اور دھرم شاسن - دیوناگری

۵۷ - رگھوونش — بنگالی

۵۸ - پربدھ چندرودیہ — بنگالی

۔ گلستان کا نثر پشائی ترجمہ

۔ سکھوں مذہب کے بارے میں معلوماتی کتاب — دیوناگری

# گلکرسٹ

۱۷۵۹ء میں اڈنبرا (Edinburgh) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے جارج ہیریئٹ اسپتال (George Hariot Hospital) میں تعلیم حاصل کی۔ عتیق صدیقی کے مطابق "اس بیان سے ہم کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی طبّی سند بھی لی تھی یا نہیں؟ اور اگر کوئی سند اس نے لی بھی تھی، تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ ۔ ۔ کسی جگہ بھی اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ نظر نہیں آتا" ؎

اس کے خود کے بیان کے مطابق تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک قسمت آزما کی حیثیت سے چند سال ویسٹ انڈیز (West Indies) میں بسر کئے اور ۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوا۔ "۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے ہی لئے خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ ہی میرے

آغاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے جب
تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دستگاہ
میں نہ حاصل کر لوں، جہاں عارضی طور پر مجھے قیام
کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو، جسے اس زمانے
میں موریس (Moors) کہتے تھے، سیکھنے کے لئے جم کر
بیٹھ گیا۔" ۲

بمبئی پہنچتے ہی گل کرسٹ کو ملازمت بھی
مل گئی اور "ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company)
کی فوج میں وہ اسسٹنٹ سرجن مقرر ہو گیا" ۳

گو تحقیقات سے ہم کو اس بات کا کوئی
ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے کوئی طبی سند لی تھی یا
نہیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ اور دیگر ذرائع
سے یہ ثابت ہے کہ وہ کمپنی کی فوج میں اسسٹنٹ
سرجن مقرر ہوا اور یہ تقرر بغیر کسی طبی سند کے
ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس کوئی اعلیٰ
1 سند نہ رہی ہو لیکن کوئی ایسی سند ضرور رہی
ہوگی جس کی بناء پر اسے سرجن مقرر کیا جا سکے
اور جو اس نے جارج ہیریٹ اسپتال سے ہی حاصل

کی ہوگی۔

فوج کی جس ٹکڑی سے اس کا

تعلق تھا اس نے ایک نومبر ۱۷۸۳ء میں فتح گڑھ

کی طرف کوچ کیا اور اس طرح گلکرسٹ ایک

ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں ہندوستانی زبان

پر کام کرنے کے بہتر ذرائع دستیاب ہو سکتے تھے۔

فتح گڑھ کے قیام کے دوران

اس نے ۲۱ جنوری ۱۷۸۵ء کو ایک سال کی چھٹی کی

درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ اس دوران

اس نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جون پور،

بنارس اور دیگر مقامات کا دورہ کیا۔ اسی دوران

اس نے ہندوستانی زبان کا علاقائی جائزہ لیا اور یہ ہندوستانی کی

قواعد اور لغت کی فراہمی کے لئے بھی مفید ثابت

ہوا اور بہت ہی کم عرصے میں اس نے مندرجہ ذیل

تصنیفات شائع کیں:

1. English and Hindustanee Dictionary (1786 - 1790)

2. A Grammer of the Hindustani language (1796)

3. The Appendix (1798)

4. The Oriental Linguist (1798)

۱۷۹۸ء کے اواخر میں گل کرسٹ بنارس
سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ کلکتہ منتقل ہونے
کے بعد ۱۳ جنوری ۱۷۹۹ء کو اس نے ویلزلی کی
ایما پر اورینٹل سیمنری (Oriental Seminary)
کا قیام کیا جس میں جونئر سول سرونٹس (Junior
Civil Servants) کو ہندوستانی و فارسی کا درس دیا
جاتا تھا۔ عملی اعتبار سے گل کرسٹ کے اس مدرسے
سے ہی فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑ گئی تھی۔
گل کرسٹ کی قابلیت اور ہندوستانی زبان
میں افسروں کو درس کی ضرورت کو مدنظر رکھتے
ہوئے ۴ر جون ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام
عمل میں آیا۔ گل کرسٹ کی قابلیت اور کارناموں
کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے جگہ جگہ اسے فورٹ
ولیم کالج کا پرنسپل لکھا ہے۔ لیکن کالج کے اس
عہدے کے لئے ایک شرط یہ تھی کہ کالج کا پرنسپل
یا پروسٹ (Provost) ہونے کے لئے انگلستان کی

کی کلیسا کا کلرجی مین (Clergyman) ہونا ضروری تھا
اور اس طرح کالج کا پہلا پرنسپل ڈیوڈ براؤن
(David Brown) مقرر ہوا جو فورٹ ولیم کا
پادری تھا اور کلکتہ بائبل سوسائٹی (Bible Society)
کا بانی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گل کرسٹ کا تقرر
ہندوستانی پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ لوگوں
نے جو تاریخی غلطیاں کی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ
علمی اعتبار سے گل کرسٹ نے جو نمایاں رول ادا
کیا وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ گل کرسٹ
کا زمانہ تھا کہ "جتنا کام خود اس نے کیا اس سے کہیں
زیادہ اس نے دوسروں سے کام لیا" ہے

ہندوستانی شعبے کے لئے اس نے ایسے
منشیوں کا تقرر کیا جو ادبی اور علمی اعتبار سے اس
سماج میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں میر امنؔ،
بہادر علی حسینی، مظہر علی ولا، شیر علی افسوس،
نہال چند لاہوری، للو لال اور سدل مسر شامل ہیں۔
ان بزرگوں سے گل کرسٹ نے
مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم کرائے ____

ظاہر ہے ان تراجم کی حیثیت محض تراجم کی نہیں بلکہ آج بھی ہندوستانی ادب میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ۔

گل کرسٹ کی تصنیفات اور کارناموں کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کا بہت ہی مختصر سیاسی اور سماجی جائزہ لیا جائے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزوں کی حیثیت اب تاجروں کی نہ رہ کر حکمرانوں کی ہوگئی تھی ۔ ظاہر ہے حکمران کی حیثیت ہو جانے کے بعد اب عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو انھیں کی زبان میں اظہار و ترسیل کر سکیں ۔ بقول ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی :

" The commerce-oriented rule reflected itself in all matters, social, political and economic, and played an important part in determining the relationship

between the Englishmen and Indians"

اظہار زیر بحث مسئلے کو مدنظر

رکھتے ہوئے اور گل کرسٹ کی کوششوں کی بناء پر

اورینٹل سیمنری (Oriental Seminary) کا قیام

انہیں ضروریات کی نشاندہی کرتا ہے۔ انہیں

ضروریات کے تحت ۲۱ دسمبر ۱۷۹۸ء میں گورنر

جنرل نے حکم جاری کیا کہ پہلی جنوری ۱۸۰۱ء

سے کوئی ملازم، ملازمت کے قابل نہیں سمجھا

جائیگا جو یہاں کے قوانین اور فارسی و ہندوستانی

زبان کی جانکاری نہیں رکھے گا۔

یہ ادارہ جو سول سرونٹس (Civil Servants) کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا تھا

عملی طور سے یہاں ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم

دی جاتی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہاں بنگالی

زبان کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ گل کرسٹ

کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ منشی بھتہ (Moonshee

allowance) جو انگریز ملازمین کو ملتا تھا

ود گلکرسٹ کو دیا جائیگا ۔ یہ طلباء گلکرسٹ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی روزمرہ کی رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی جاتی تھی تاکہ اسے ادارے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے ۔

گلکرسٹ کی قابلیت اور محنت سے متاثر ہوکر ویلزلی نے ایک بڑے ادارے کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا جس میں مختلف قسم کی تعلیم کا انتظام کیا جاسکے اور تھوڑے ہی دنوں بعد فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا لیکن کالج بہت دنوں تک نہ چل سکا کیونکہ کورٹ آف ڈائرکٹرز (Court of Directors) اس قسم کے ادارے پر ایک کثیر رقم صرف کرنے کے حق میں نہیں تھا اور اسکا خیال تھا کہ ہندوستانی زبان سیکھنے کے لئے کچھ منشیوں کی ٹریننگ کافی ہوگی جس کے لئے اتنے بڑے کالج کی ضرورت نہیں ہے ۔ ویلزلی کے اس خیال کو غلط سمجھا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ بجائے اس کے کہ کمپنی کی آمدنی بڑھائی جائے ، بڑی فضول خرچی کی جارہی

آمادہ ہے۔ لو، ا ڈاکٹر کالج بند کرنے کا مشورہ دیا۔ ویلزلی نے کالج بند نہ کرنے کے سلسلے میں بہت دلائل دیے لیکن جب اس کی بات نہیں مانی گئی تو اس نے گورنر جنرل کے عہدے سے استعفی دے دیا۔ [۲۷]

اسی ضمن میں ڈاکٹر قدوائی نے لکھا ہے

کہ:

"A highly sophisticated system of Education designed to inculcate superior intellectuals and [mor]al qualities was beyond the app-reciation of the directors, simply because the correction of moral and creation higher values of head and heart was not their obligation. They were concerned with such things only to the extent they

were useful for their trade."

یہاں اس بات کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کالج بند کرنے کی وجہ محض مالی دقت بتائی گئی جبکہ ویلزلی نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ کالج پر خرچ ہونے والی رقم کا انتظام وہ خود دیگر ذرائع سے کریگا - اور جس کا ایسٹ انڈیا کمپنی سے کوئی تعلق نہ ہوگا - یہی وجہ تھی کہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کی منظوری کے بغیر اس نے کالج کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔

یہاں چونکہ گل کرسٹ کے کارناموں پر بحث کی جا رہی ہے اس لئے مندرجہ بالا موضوع پر تفصیلی بحث مناسب نہیں - صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ حکمران طبقے کو تحصیل زر کے علاوہ کسی اور چیز کو اہمیت دینے میں دلچسپی نہیں تھی اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ۲۴ جون ۱۸۰۲ء کو ویلزلی نے کالج بند کرنے کا حکم جاری کیا۔

اتنی تھوڑی مدت میں ہی کالج میں جو کام ہوئے وہ گل کرسٹ کی کوششوں کا نتیجہ ہے

جا سکتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء تک کالج سے چھپ کر ۴۶ کتابیں شائع
ہوئیں جن میں ۲۹ کتابیں اردو میں تھیں۔ ان میں
باغ و بہار، اخلاق ہندی، باغ اردو، نثر بے نظیر،
مرثیہ مسکین اور طوطا کہانی وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے
علاوہ چودہ کتابیں زیر اشاعت تھیں۔ جب تک
گل کرسٹ کالج سے منسلک رہا تب تک تقریباً ساٹھ
کتابیں اردو میں چھپ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ
تیرہ کتابیں جو گل کرسٹ نے چار سالوں میں لکھیں
وہ بھی منظر عام پر آ چکی تھیں۔ جہاں تک ہندوستانی
زبان و ادب سے گل کرسٹ کی دلچسپی کا سوال ہے
اس سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں۔
یہ سچ ہے کہ وہ کچھ تاجرانہ ذہنیت کا مالک تھا
لیکن جو ادبی کارنامے اس نے انجام دئے
ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی نیت پر
سوالیہ نشان لگانا بھی بجا نہیں۔

گل کرسٹ نے ہندوستانی قواعد و
لغت کا کام ایک جگہ بیٹھ کر نہیں کیا بلکہ اس نے اس
بات کو ضروری سمجھا کہ مختلف علاقوں کا دورہ کرکے

زبان کے علاقائی استعمال اور ہیئت کا جائزہ لیا جا سکے اور جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ کمپنی سے چھٹی لے کر اس نے ان تمام اہم علاقوں کا دورہ کیا جو ہندوستانی زبان کے اہم مراکز تھے۔ لیکن وہ اس بات کو قلم بند کرنا بھول گیا کہ ان علاقوں کا دورہ کرتے وقت وہ کون کون علماء سے ملا۔ اس کے سامنے دقّت یہ تھی کہ وہ کسی لغت یا قواعد کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے مختلف الفاظ کو اہل زبان کی زبان سے ادا کروایا اور نوٹ کیا۔ ۱۰ انھیں قو بیوں کی بناء پر گل کرسٹ نہ ہی صرف عالم قواعد یا اچھا لغت نویس (Lexicographer) ثابت ہوا بلکہ ایک بہترین اردو مدرس کی بھی حیثیت حاصل کی۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ٹھیک ہی لکھا ہے: ۱۱

"Infact, all that Gilchrist contributed to the Urdu studies was motivated by one single objective i.e.

the teaching of Urdu to Englishmen, and real worth of his grammar, dictionary and other works can be judged only in this context."

اس نے زبان سیکھنے کے سلسلے میں دو باتوں پر زور دیا۔ اول الفاظ اور دوسرے الفاظ کا صحیح استعمال۔ اورینٹل لنگوسٹ (Oriental Linguist) میں اس نے لکھا ہے۔ [12]

"--- two things are chiefly to be considered in the learning of language; first, the words, then using those words conformable to the genius of the language. The one is the object of memory, the other that judgement and reflection. The learning of words is nothing less than getting by heart the whole dictionary of a

languages and can not be possessed within a small compass of time, even by the best memory that youth was ever blessed with. The right placing and using words in speech, require a constant and steady application of the minds and can not be acquired, but by much meditation upon the language, either by oneself, or with a teacher, by frequent construing and turning that language into our mother-tongue and vicissim our mother-tongue into that language, and comparing all along the genius and idiom of the two languages."

گل کرسٹ ایک عالم قواعد ہونے کے ساتھ ساتھ
زبان سیکھنے میں صرف قواعد ہی نہیں بلکہ سماج میں زبان
کے استعمال پر بھی زور دیتا ہے ۔ (ظاہر ہے انھیں بنیاد
پر اس نے قواعد اور لغت بھی مرتب کی تھی) ۔ وہ
منشیوں سے بات چیت کے علاوہ گھر کے نوکروں سے
بھی زبان سیکھنے کی کوشش کرتا ہے جو بعد کو زبان
کی تعلیم میں بھی کارگر ثابت ہوئے ۔ اور اس طرح
قواعد کو روزمرہ کے استعمال سے الگ کرکے نہیں
دیکھتا۔

زبان سیکھنے کے سلسلے میں جو طریقہ کار
گل کرسٹ نے سامنے رکھا وہ یوں ہے :

۱۔ کورس میں قواعد شامل کی جائے
اور اسکی وضاحت منشیوں کے ترجمے کی
مدد سے کی جائے۔ شروع سے ہی بات
چیت اور لب و لہجے پر خاص توجہ دی جائے۔

۲۔ اورینٹل لنگوسٹ (Oriental Linguist)
کی مدد سے پہلے سیکھی ہوئی چیزوں کی اور
بھی اصلاح کی جائے اور بول جانے زبان کے مختلف

از قبول ... روشناس کرایا جائے۔ نثر و نظم کا علم ترجمہ، تشریح، محاوروں سے واقفیت، کہاوتیں اور قواعد کی مشق کرائی جائے۔

۳۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کرائے جائیں۔

۴۔ اردو نثر و نظم کو بلند آواز میں پڑھایا جائے۔

۵۔ منشی کی مدد سے صوتی مشقیں کرائی جائیں۔ کچھ خاص آوازیں جیسے ق غ خ وغیرہ کو ادا کرنے کی مشق کرائی جائے۔ آوازوں کا علم ہونے سے پہلے شروع میں ان کی جگہ دوسرے حروف جیسے g یا k بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

۶۔ حرف عطف (Conjunctions) اور ان کی مشق۔

۷۔ رومن رسم خط میں لکھے ہوئے متن کو سامنے رکھ کر منشی انھیں کس طرح ادا کرتا ہے بطور سنایا جائے جس سے علاقائی لب و لہجہ اور تلفظ سے کانوں کو مانوس کرایا جائے۔

۶ - اور پھر اردو رسم خط کی ٹریننگ
دی جائے۔ ۱۳

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ گل کرسٹ
کے طریقے کے مطابق رسم خط سیکھنے کا مسئلہ بعد میں آخر
میں آتا ہے۔ اسکا خیال تھا کہ اگر شروع سے طلباء کو
رسم خط سکھانے کی کوشش کی گئی تو وہ گمراہ ہو
سکتے ہیں اور زبان سیکھنے کا راستہ اور مشکل ہو جائے
گا۔ ساتھ ہی ابتداء میں طلباء کو اتنی زیادہ محنت نہ
کرائی جائے کہ پریشان ہو کر ان کی دلچسپی ختم ہو جائے۔
اس کے علاوہ گل کرسٹ نے رسم خط کے بارے میں رومن
رسم خط کو اہمیت دی کیونکہ اردو سیکھنے والا انگریز
پہلے سے اس رسم خط سے واقف ہوتا ہے۔ اور کچھ
مخصوص آوازوں کے لئے (جن کا رومن میں کوئی تصور
نہیں ہے) اس نے اپنی مخصوص علامتیں تجویز کیں۔
ڈاکٹر قدوائی کے مطابق گل کرسٹ
اس حقیقت سے باخبر تھا کہ طلباء اس طرح کے مشکل
طریقوں سے پریشان ہو سکتے ہیں اور آسان سے آسان تر
طریقے کی تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح کے طریقوں سے

دور رہنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ہی گل کرسٹ نے
طلباء کی نفسیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اورینٹل
لنگوسٹ (Oriental Linguist) لکھی ۔ جو ڈاکٹر قدوائی
کے الفاظ میں ہندوستانی کے استاد اور مبلغ، گل کرسٹ کی
دو حیثیتوں کے بیچ ایک سمجھوتے کی حیثیت رکھتی ہے ۔[11]

گل کرسٹ کی کوششوں سے پہلے
فارسی اور عربی پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان زیادہ اہمیت
رکھتی تھی ۔ مگر گل کرسٹ نے محسوس کیا کہ ہندوستانی سرزمین
پر اردو یا ہندوستانی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور فارسی
یا عربی، اردو کی جانکاری کے بعد اور آسانی سے سیکھی
جا سکتی ہیں ۔

انھیں بنیاد پر اس نے اردو
سیکھنے کی جو کتابیں تیار کیں وہ دوسرے یورپی مصنفین
سے بالکل الگ تھلگ تھیں اور اس طرح پہلی بار
گل کرسٹ نے اردو کی تعلیم کے سلسلے میں جو کتابیں
تیار کیں وہ قواعد اور علم اللسان کے اعتبار سے
پہلے کی گئی کوششوں سے زیادہ سائنٹفک اور آسان
تھیں ۔

جہاں تک علم اللسان کا تعلق
ہے گل کرسٹ کے سامنے وہ سارے کارنامے تھے جو مختلف
ہندوستانی عالموں نے قواعد و زبان کے سلسلے میں کیے
تھے اور جنکا اعتراف گل کرسٹ نے خود کیا ہے،
جو کچھ بھی مواد اس نے اکٹھا کیا وہ یورپی
علماء سے اور اپنے خود کے تجربوں اور کوششوں
سے حاصل کیا — مختلف علاقوں کا سفر کرکے
گل کرسٹ نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی ایک ایسی
زبان ہے جو تقریباً سارے ہندوستان میں بولی اور
سمجھی جاتی ہے جسکی بنیاد پر اس نے لکھا: جملے

"--- the peasant, the artist, the merchant, the priest, the soldier, the gentleman, the courtier, the prince and the king --- whether a follower of Qoran or Shastur, all speak and think, in this, their vernacular tongue."

گل کرسٹ زبان کو ہندوستانی کا نام

دیتے وقت لکھتا ہے: ص ۱۴

"Before the irruption and subsequent settlement of Moosulmans the Hindooee or Hindee was to India, what the Hindoostanee is now to Hindoostan, varying more or less in its territorial excursion from the pure speach called by way of pre-eminence Brij Bhasha or the language of India. This ancient tongue, under various modifications is to Hindoostan, exactly what the Saxon was to England, befor the Norman conquest."

دوسری جگہ لکھتا ہے: ص ۱۲

"Hindoos will naturally lean most to the Hindooee, whilst

the Moosulmans will of course be more partial to Arabic and Persian; whence two styles arise, namely the court or high style and the country and the pristine style, leaving the middle or familiar current style between them, which I have recommended as the best."

وہ ہندوستان میں تین اہم زبانوں کی بات کرتا ہے جن میں ہندی، سنسکرت اور ہندوستانی آتی ہیں۔ ہندی اور ہندوستانی کو زندہ زبان تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ سنسکرت کو ایک مردہ زبان قرار دیتا ہے اور کہتا ہے: ۱۸

"--- (Sunskrit) really the dead letter of the civil and religious policy ---".

ہندی کی مختلف شکلوں کو مندرجہ

زبانوں میں تقسیم کرتا ہے: ۹۱؎

1. Bungalee
2. Rajpootee
3. Poorbee
4. Dukhanee
5. Ooreea
6. Mulwaree
7. Gujratee
8. Tilungee
9. Kishmeere

ہندوستانی کو وہ تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

1. The high, court, or Persian style
2. The middle or genuin Hindoostanee style
3. The vulgar or Hinduwee

پہلے حصے میں وہ سودا اور میر درد کی شاعری کو رکھتا ہے جن میں عربی اور فارسی کی طرف زیادہ

جھکاؤ ہے۔ دیباچے میں جب وہ اصلی پریشانی کہتا ہے،
مسکین کا مرثیہ یا سودا کی ہجویات کو رد کرتا ہے اور
طرزِ تحریر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ لیکن
وہ یہاں کوئی نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ: ۲

"As the language is still fluctuating and unsteady, it will be found difficult, if not possible, to avoid the extremes to which it is found certainly exposed in a country especially, where pedantry, so far from being decried, is esteemed as touch-stone of learning; and where, on one hand the learned Moosulman glories in his Arabic and Persian, and, on the other, the Hindoo is no less attached to his Sunskrit and Hinduwee."

الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں
اس کا خیال ہے کہ یہ مختلف علاقوں میں مختلف
انداز سے دیکھا جاسکتا ہے - وہ کہتا ہے کہ: [١٢]

"--- to a Bungalee ear, would shock a native of Dihlee, and other in harmonious unison with the articulation at Bunarus---."

گل کرسٹ نے ہمیشہ زبان کے
مسئلے پر اسی زبان کو ترجیح دی اور وکالت کی جو
سارے ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی
ہے - وہ تمام زبانوں کو سامنے رکھ کر ایک
معیاری زبان (Standard language) کی بات
کرتا ہے اور اس ضمن میں اس کے سامنے صرف ہندوستانی
ہے -

گل کرسٹ کی دانشوری کا ذکر
کرتے ہوئے ڈاکٹر قدوائی لکھتے ہیں: [١٣]

"He was unaware of the stage

by stage development of the Indo-Arian language which he called Hinduwee before the coming of Muslims. He knew nothing about Prakrit. About the existance of ~~ka~~ Dravidian language. He had never heard or read; and of Apa Bhransha, he was equally ignorant.

یہی حال تالیف لغت کے سلسلے میں تھا۔
گل کرسٹ کی تالیف کردہ لغت (۱۷۸۶ء) اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کو اس سلسلے میں جو کام ہو چکا تھا اس کا علم نہ تھا کیونکہ کہیں بھی سراج الدین علی خاں آرزو کی تخلیق کا ذکر ہے اور نہ ہی دوسرے علماء کا۔

حالانکہ گل کرسٹ نے تالیف لغت کے سلسلے میں منشیوں سے کافی مدد لی جس کا اس نے

اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دعویٰ کرتا ہے
کہ یہ کام اس کی خود کی محنت کا نتیجہ ہے جس میں
ایسے لوگوں کی ذرہ برابر مدد نہیں لی گئی جو اس
زبان کو ایک مدت سے استعمال کرتے رہے ہیں۔

۱؎

عتیق صدیقی: گل کرسٹ اور اس کا عہد ص: ۳۷

انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، نئی دہلی سنہ ۱۹۷۹ء

۲؎

Asiatic Annual Register

(بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص: ۴۱-۴۰)

۳؎

ایضاً ص: ۲۹

۴؎

ایضاً ص: ۲۳

۵؎

S. R. Kidwai

Gilchrist and the language of Hindoostan Page: 2

(Rachna Prakashan, New Delhi - 1972)

e4

Akshay Kumar Ghoshal:
Civil Services in India (Under East India Company) Page: 244-45
University of Calcutta - 1944

e<

The Wellesley Papers
ed. by: The editors of Windham Papers
London - 1914

e^

S. R. Kidwai:
Gilchrist and the language of Hindoostan
(Page: 17-18)

e9 Ibid (Page - 18)

e1.

J. B. Gilchrist:
Appendix - Page: VII-VIII

ح۱۱

S. R. Kidwai:

Gilchrist and the language of Hindoostan

Page - 67

ح۱۲

J. B. Gilchrist:

Oriental Linguist - Page: V

Calcutta - 1798

ح۱۳

S. R. Kidwai:

Gilchrist and the language of Hindoostan

Page: 74.

ح۱۴

Ibid Page: 76

"--- which was a compromise between Gilchrist the teacher and Gilchrist the preacher of "Hindoostanee". He expected that

. . .

those who depend very much on "the dormish medium of dialogue" would find enough incentive in the Oriental Linguist to take the help of a munshi and use other familiar exercise in study "because I conceive every other mode of consulting dialogue, productive of both indolence and ignorance, with the double deception of another's plausibly imposing upon their readers"---, but he still asserted that "--- those scholars who meddle least with humdrum collection of ready made dialogue, will make the greatest real progress in Hindoostanee".

৫১৫

J. B. Gilchrist :

Appendix — Page – XXI

৫১৬ J. B. Gilchrist :

Oriental Linguist

Page – IV

৫১৭

J. B. Gilchrist :

Appendix

Page – XXII

৫১৮

Ibid

Page – XXII

৫১৯

Ibid

Page : XXII – XXIII

৫২০ J. B. Gilchrist.

Oriental Linguist

Page – 56

۱۴ے

S. R. Kidwai :

Gilchrist and the Language of Hindoostan

Page : 93

# گریرسن کی لنگوسٹک سروے آف انڈیا

نویں جلد : حصہ اوّل (صفحات ۸۰۷)
پہلی اشاعت : ۱۹۱۶ء
دوسری اشاعت : ۱۹۶۸ء
اشاعت گھر : موتی لال - بنارسی داس
جواہر نگر، دہلی -

یہ کتاب جس میں ہندوستان کی تمام زبانوں اور بولیوں کے ارتقاء پر بحث اور تجزیہ کیا گیا ہے، گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے - اس میں نویں جلد کے پہلے حصے میں مغربی ہندی (ہندی اور اردو) اور پنجابی سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ گریرسن نے زبانوں اور بولیوں کے خاندانوں کی تقسیم کرتے ہوئے اسے ہند آریائی خاندان کا نام دیا ہے -

زبان پر بحث شروع کرنے سے پہلے

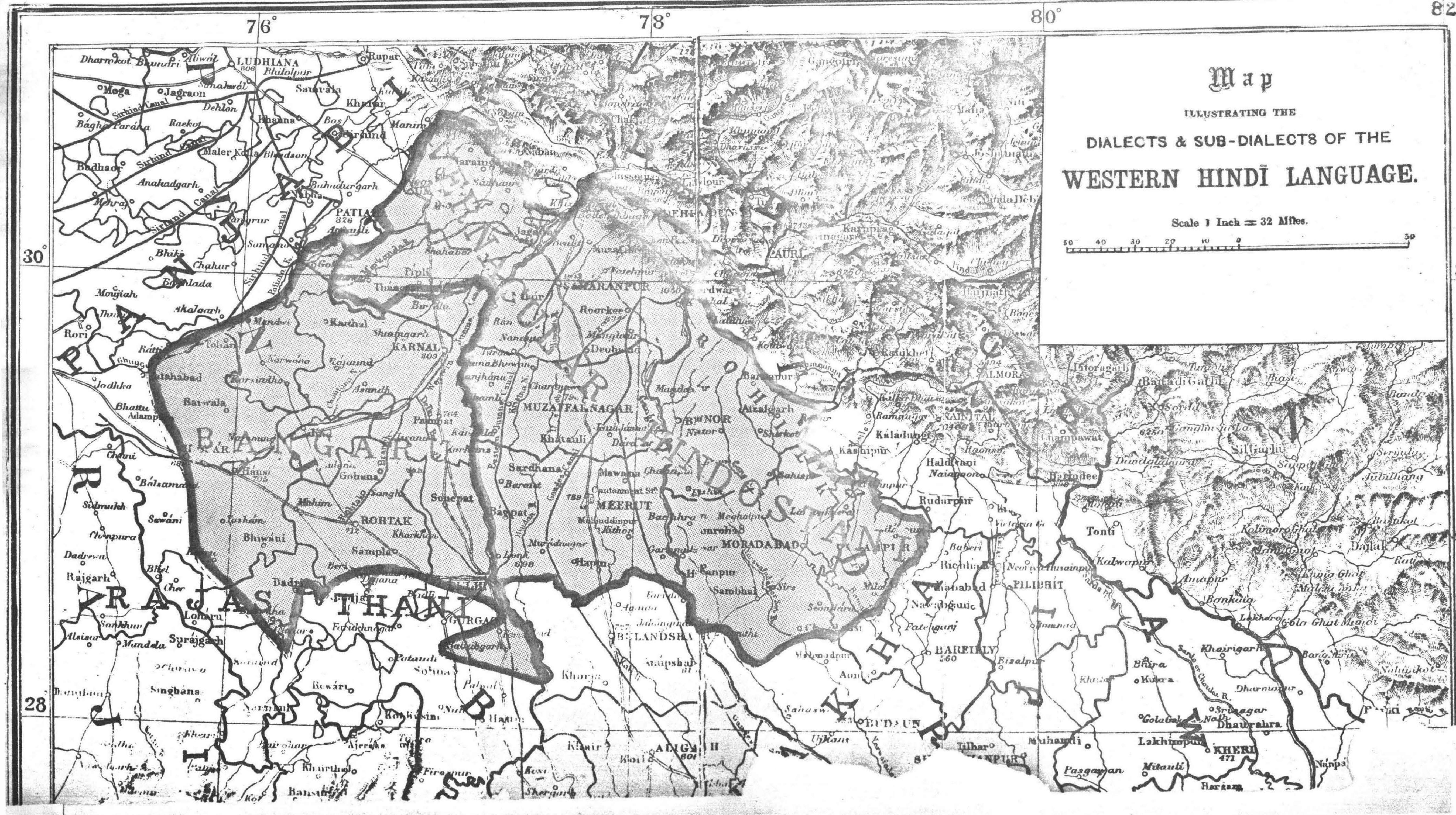
Map
ILLUSTRATING THE
DIALECTS & SUB-DIALECTS OF THE
WESTERN HINDĪ LANGUAGE.
Scale 1 Inch = 32 Miles.
76°
78°
80°
82°
30°
28°
BANGAR
RAJASTHANI
HINDOSTANI
LUDHIANA
PATIALA
KARNAL
ROHTAK
MEERUT
MUZAFFARNAGAR
MORADABAD
BAREILLY
PILIBHIT
BUDAUN
ALIGARH
BULANDSHAHR
DEHRA DUN
SAHARANPUR
ALMORA
NAINITAL
KHERI

مصنف نے اٹلس کے نقشوں کا ایک خاکہ بھی
پیش کیا ہے جو مغربی ہندی اور اردو کے حروف
کو انگریزی میں ادا کرنے کا طریقہ کار پیش کیا
ہے۔ مغربی ہندی کے جغرافیائی حدود کا ذکر
کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ زبان مدھیہ دیس
(Madhya desa) میں بولی جاتی ہے جس کی حدبندی
مغرب اور مشرق میں سرسوتی سے لیکر آج کے
الہ آباد تک کی جا سکتی ہے اور جنوب و شمال میں
ہمالیہ سے نرمدا تک علاقوں کو اور واضح کرنے کے
لئے مصنف نے نقشہ بھی پیش کیا ہے۔
اس علاقے کو گریرسن ہندو
تہذیب کا مرکز مانتا ہے۔ اس کے مطابق مغربی
ہندی یو۔پی۔ کے مغربی علاقے، پنجاب کے
مشرقی ضلعوں میں، مشرقی راجپوتانہ، گوالیار، اور
بندیل کھنڈ اور مدھیہ پردیش کے جنوب مغربی
علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔
مزید برآں اس کی ایک اہم
بولی ہندوستانی، تقریباً سارے ہندوستان میں بولی اور

سمجھی جاتی ہے۔ گریرسن مغربی کو پانچ بولیوں
میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ ہندوستانی

۲۔ بانگڑو

۳۔ برج بھاشا

۴۔ قنوجی اور

۵۔ بندیلی۔

ہندوستانی علاقائی زبان کی
حیثیت سے مغربی روہیل کھنڈ، دوآبہ اور انبالہ کے
پنجاب ضلع بولی جاتی ہے۔ یہ مسلمان بادشاہوں
کے ذریعے سارے ہندوستان میں پھیلی۔ ادب اور
تہذیب کے میدان میں کافی اہمیت حاصل کی
ہے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ادبی ہندوستانی: ادبی طور پر ہندو
اور مسلمان دونوں میں مقبول ہے اور لنگوافرنکا کی
حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ اردو: خصوصاً اس کا استعمال
مسلمانوں میں عام ہے اور ان ہندوؤں میں جنہوں نے

مسلم تہذیب اختیار کر لی ہے

۳۔ ہندی: اس کا استعمال ہندوؤں میں عام ہے اور ہندو مذہبی تعلیم تک محدود ہے۔

آگے وہ اردو پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے بھی دو روپ ہیں:

۱۔ دہلی اور لکھنؤ کی معیاری ادبی زبان۔

۲۔ دکھنی جس کا استعمال دکن کے مسلمان ادبی طور پر کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بانگڑو، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی کی مختصر تعریف کرتا ہے۔

زبان کے ارتقاء اور جغرافیائی علاقائیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس کا سیدھا رشتہ اپبھرنش اور سورسینی سے ملتا ہے۔ یہ ان علاقوں میں بولی جاتی ہے جو آریاؤں کی تہذیب کا مرکز رہے ہیں۔

ہوئرنلے ہندی کی لسانی درجہ بندی کرتے

ہوئے کہتا ہے کہ اس کے جنوب مغرب میں پنجابی
شمال مغرب اور شمال میں رجستھانی، شمال مشرق
میں سرائکی اور مشرق میں مشرقی ہندی، جنوب میں
ہند آریائی بولیاں دون ساری، گڈھوالی، کماؤنی۔
رسم خط کا ذکر کرتے ہوئے وہ
مغربی ہندی لکھنے کے دو طریقے بتاتا ہے۔ ہندوستانی
کے لئے فارسی رسم خط اور دوسری بولی کے لئے دیوناگری۔
زبان کے قواعد کے سلسلے میں اس کا خیال ہے کہ
مغربی ہندی کی تمام بولیوں کے لئے ہندوستانی کی
قواعد ہی معیاری مانی جاتی ہے۔
اس کا کہنا ہے کہ ہندوستانی کا استعمال
سب سے پہلے ۱۶۱۶ء میں ٹیری نے کیا جب وہ
ٹام کوریٹ (Tom Coryate) کا ذکر کرتے ہوئے کہتا
ہے کہ اسے ہندوستانی پر عبور حاصل ہے۔ یول (Yule)
فرائر (۱۶۷۳ء) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ درباری
زبان فارسی ہے اور عام طور پر استعمال کی جانے والی
زبان ہندوستانی (Indostan) ہے جس کا کوئی باقاعدہ
رسم خط نہیں ہے۔ لکھی جانے والی زبان کو بنیان

(Banyan) بنئے پر ۔

مغربی ہندی کی تعریف کے بعد اس نے ایک بہت ہی طویل فہرست کتابیات کی دی ہے اور ہندوستانی کے ارتقاء پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغربی ہندی کی بولی کی حیثیت سے اس کے کئی ٹکڑے ہیں جنہیں موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عام ہندوستانی
۲۔ ادبی ہندوستانی

عام ہندوستانی اوپری دوآبہ اور مغربی روہیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور ادبی ہندوستانی تقریباً تمام ہندوستان کی ایک شائستہ زبان ہے جو خصوصاً شمالی ہند کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان ہے۔ ادبی ہندوستانی اتنی مقبول اور اہم ہے کہ اسے مغربی ہندی کی معیاری بولی کہہ سکتے ہیں۔

گریرسن ادبی ہندوستانی میں اردو اور ہندی دونوں کو شامل کرتا ہے۔ اس کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لفظ ہندوستانی

لفظ — (Hindostani) ہے نہ کہ ہندستانی (Hindustani)
ہندوستان (Hindostan) فارسی سے ماخوذ ہے جس کے
معنی ہندوؤں کا ملک ہے ۔ ہندوستانی لفظ یورپی
اثرات کے تحت وجود میں آیا جس کے معنی
ہندوستان کی زبان کے ہیں ۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ
ٹیری (Terry) اور فرائر (Fryer) جیسے لوگوں
نے اس وقت بولی جانے والی زبان کو Indostan
لکھا ہے اور قدیم برطانوی مصنفین نے اسے مورس
(Moors) اور شاید گلکرسٹ پہلا شخص ہے جس
نے ۱۷۸۷ء میں "ہندوستانی" کا استعمال کیا ۔

اول ہندوستانی کو اعتبار سے
ہندوستان کے مہذب لوگوں کی زبان ہے جو تقریباً
سارے ہی ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور
ادب میں نظم و نثر دونوں کی زبان ہے ——
اس کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ
یہ کہنا مشکل ہوگا کہ اس زبان کو بولنے والے کتنے
ہیں ۔ علاوہ اس کا استعمال ~~~ مختلف شکلوں

میں ہوتا ہے کیونکہ تھوڑی پر بولیوں میں فرق
آ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے شہروں
میں ہندو ان کا اردو طریقہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں
عام ہے۔ لیکن اس کا استعمال کرنے والوں کی تعداد
بتانا مشکل ہے۔ صرف ہندوستانی کی دکنی شکل کی
تعداد پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد گریرسن
نے ایک فہرست (Table) کے ذریعے یہ بتانے کی
کوشش کی ہے کہ مختلف بولیوں کے بولنے والوں
کی تعداد کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

Table showing the estimated number of speakers of literary Hindostani in various provinces of India:

| Province | Estimated No |
|---|---|
| Assam | 32,290 |
| Bengal | 1,828,372 |
| Berar | 4,000 |
| Bombay: | |
| Gjurat 101,191<br>Sindh 18009 | 119200 |

| | |
|---|---|
| Burma | 8,36,941 |
| Central Province | 80,256 |
| Panjab | 1,329,801 |
| United Province | 3,859,291 |
| Baroda | 11026 |
| Mysore | 25,534 |
| Rajputana, Central India & Ajmer-Merwara | 322,000 |
| Kashmir | 800 |
| Add. Figures for Dakhni | 3,654,172 |
| Total | 11,350,436 |

زبان کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے

وہ کہتا ہے کہ ہندوستانی لنگوافرینکا کی حیثیت سے
بولی جس کا رشتہ دہلی کے بازار سے جوڑا جا
سکتا ہے اور جہاں کھچڑی زبان استعمال میں آتی
تھی۔ یہ زبان مغل فوجیوں کے ذریعے جائی
گئی اور تب سے اس نے سارے ملک میں اپنی
دھاک جمالی۔ یہ زبان ان تمام لوگوں نے قبول
کی جو اسلام کے پیرو تھے (جو حکمرانوں کا مذہب
تھا) اور اس کی آسان قواعد اور غیر معمولی ذخیرہ
الفاظ نے ترسیل کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔
گریرسن ادبی ہندوستانی کو کئی
حصوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں اردو، ریختہ، دکنی
اور ہندی کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہے۔ اردو
کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ اردو ہندوستانی
کی ایک ایسی شکل (form) ہے جس کا رسم خط
فارسی ہے اور جس کے ذخیرۂ الفاظ میں آزادی سے
فارسی کا استعمال (اور عربی کا بھی) ہوتا ہے۔ کہا
جاتا ہے کہ لفظ 'اردو'، اردوئے معلی یا

شاہی فوجی بازار سے ماخوذ ہے۔ بنیادی طور پر شمالی ہندوستان کے ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے حلقوں میں بولی جاتی ہے جو فارسی تہذیب سے زیادہ متاثر ہیں۔ حالانکہ فارسی کے الفاظ ہندوستان کی تمام بولیوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ فارسی الفاظ پر پابندی لگانا ویسے ہی مشکل ہے جیسے لاطینی الفاظ جو انگریزی میں رچ بس گئے ہیں، ان پر پابندی لگانا۔ لیکن جہاں تک معیاری اردو کا تعلق ہے، فارسی الفاظ کا استعمال شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر ایسی تحریروں میں شروع سے لے کر آخر تک فارسی الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ صرف قواعد سے پتہ لگتا ہے کہ یہ زبان اردو ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ زبان کو شدید فارسی زدہ کرنا ان حکمرانوں کا کام نہیں جو عوام کی زبان سے ناواقف تھے۔ دوسری طرف اردو کی ترقی میں ان کایستھوں اور کھتریوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنے حکمرانوں کی زبان میں لکھنے کی کوشش

کی - یہ ایسے لوگ تھے جو حکومت کے نظم و نسق سے تعلق رکھتے تھے اور جو فارسی داں تھے۔ ان کی حیثیت ان ایرانیوں یا ترکوں کی نہ تھی جو کئی صدیوں تک صرف اپنی زبان کا استعمال کرتے رہے اور عوام سے کٹے رہے - سر چارلس لائل (Sir Charles Lyall) کے مطابق اس طرح اب فارسی ہندوستان کی غیر ملکی زبان نہیں رہ گئی تھی لیکن خالص فارسی کا استعمال (جیسا کہ بہتوں نے کیا) اور عوام سے رشتہ ختم کرنا سیاسی ناسمجھی کے علاوہ اور کچھ نہیں - گریرسن نے بھی چارلس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار اگر کوئی لفظ ہندوستانی میں داخل ہو گیا تو کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، اس کا جا ہے جو بھی ساخت ہو - اختلاف رائے وہاں ہو سکتا ہے کہ کن الفاظ کو زبان نے قبول کر لیا ہے اور کن الفاظ کو جگہ نہیں ملی - اور یہ صرف اسلوب کا فرق ہے ویسے ہی جیسے انگریزی میں مختلف اسلوب ہیں - اس علاوہ اس میں

لوگوں کی اپنی پسند اور ناپسند بھی کو بھی دخل ہے۔
ریختہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ
لکھتا ہے کہ یہ ایسی زبان ہے جو بکھری ہوئی یا
ٹکڑے ٹکڑے ہو اور یہ ایسی شکل (form) جو
اردو شاعری میں ملتی ہے ۔ اس میں مقامی بولیوں کے
علاوہ فارسی کے بکھرے ہوئے الفاظ بھی ملتے ہیں۔
جب عورتیں اپنی مخصوص بولی میں شاعری کرتی
ہیں تو اسے ریختی کہتے ہیں اور اس کا الگ اپنا
ذخیرہ الفاظ ہے ۔

دکنی کو ہندوستانی کی ایسی شکل
کہا جا سکتا ہے جو دکن کے مسلمان استعمال کرتے
ہیں ۔ کہا گیا ہے کہ اردو کی طرح یہ بھی فارسی رسم خط
میں لکھی جاتی ہے لیکن فارسی زدگی (Persianisation)
سے بہت آزاد ہے ۔ اس کی قواعد ( جیسے
"مجھکو" کے بجائے "میرے کو" ) جنوبی ہند کے دیہاتی
علاقوں ( جو ادبی بولیوں میں نہیں ملتی ) جیسی
ہے ۔

اس کے بعد مصنف کے ہندی

کی گئی ہے تفصیل سے کی ہے۔ اور آگے چل کر ہندی اور اردو کے فرق کو اور بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی کو ہندی اور اردو سے الگ کرکے دیکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستانی ایسی زبان ہے جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے۔ اور جس میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا کثرت سے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح اردو ہندوستانی کی اس خاص قسم تک محدود ہو جاتی ہے جو صرف فارسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے اور جس میں فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہوں۔ اسی طرح ہندی کو ایک ایسی زبان کہہ سکتے ہیں جو صرف دیوناگری رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے اور جس میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہو۔

ادبی زبان کی حیثیت سے

ہندوستانی کے ابتدائی نمونے اردو میں یا بنیادی طور پر ریختہ میں ملتے ہیں۔ چونکہ زیادہ تر

تمام روایات منظوم ہیں۔ دکن میں اس کی ابتداء
سولہویں صدی سے ہوئی اور وہاں میں اس نے
ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ خصوصاً ولی اورنگ آبادی
کا بہت بڑا مقام ہے جنھیں "بابائے ریختہ" کہا جاتا
ہے۔ ولی کی روایت بہت جلد دہلی پہنچی
جہاں شاعری کا ایک اسکول وجود میں آ گیا
تھا جس کے رہنماؤں میں سودا اور میر جیسے
لوگ شامل تھے۔ اس پائے کا ایک اور اسکول
لکھنؤ میں اٹھارویں صدی میں وجود میں آیا۔
اردو اور دوسری بولیوں کی شاعری میں سب سے
بڑا فرق عروض کا تھا۔ اردو کی شاعری کی بنیاد
فارسی علم عروض پر تھی تو دوسری بولیوں میں
خالص ہندوستانی پن کی جھلک ملتی ہے ——
اردو نثر کی ادبی ابتداء انیسویں صدی میں کلکتے
سے ہوئی۔ ہندی کی طرح یہ بھی انگریزی اثرات
کی وجہ سے اور فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی کے
دونوں روپ میں درسی کتابوں کی ضرورت کی وجہ
سے ہوئی۔ میر امن کی "باغ و بہار"، حفیظ الدین احمد کی

"خرد افروز" اردو نثر کے ابتدائی نمونے ہیں اور
للو لال کی "پریم ساگر" ہندی نثر کے ضمن میں
رکھا جا سکتا ہے۔

گریرسن کے مطابق اردو
اور ہندی جو ہندوستان کے دو اہم مذاہب کی نمائندگی
کرتی ہیں، ان کا علاقہ بہت ہی وسیع ہے۔
ادبی اعتبار سے دو مخالف شہر دہلی اور لکھنؤ
خود کو اردو کے صدر مقام ہونے کا دعویٰ کرتے
ہیں۔ گو کہ دونوں کے اسالیب میں نمایاں فرق ہے
لکھنؤ کی اردو دہلی کے مقابلے میں زیادہ فارسی آمیز
ہے۔ وہ دہلی کی اردو میں زیادہ ہندوستانیت
محسوس کرتا ہے۔ یہاں کے فن کار مقامی الفاظ کے
استعمال سے ہچکچاتے نہیں جبکہ لکھنؤ کے لوگ
فارسی الفاظ کے کثرت استعمال کو بھی کمال فن
سمجھتے ہیں۔ اردو کی طرح ہندی کے بھی دو
ادبی اسکول ہیں۔ بنارس اسکول اور آگرہ اسکول۔
بنارس اسکول کے ادیبوں کا رویہ اردو کے لکھنؤ
اسکول جیسا ہے جو ہندی میں سنسکرت الفاظ کے

کہ استعمال پر زیادہ زور دیتے ہیں جبکہ آگرے

کے ادبا کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔

ہندی کے رسم خط کا دوبارہ

ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک مذہبی

مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان عام طور سے کچھ

حروف کے اضافوں کے ساتھ فارسی رسم خط کا

استعمال کرتے ہیں اور ہندو دیوناگری یا کیتھی رسم خط

کا استعمال کرتے ہیں۔ آسان ہندوستانی جو نہ فارسی

زدہ ہے اور نہ ہی سنسکرت زدہ عموماً دونوں میں

لکھی جاتی ہے۔ عام طور پر اس طرح کی کتابیں زیادہ

مقبول ہوتی ہیں جو دونوں رسم خط میں چھپی ہوں۔

یہ ایک اہم بات ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں

کائستھ دونوں رسم خط سے واقف ہیں۔

جب ہندوستانی کو اردو کے

نام پر زیادہ فارسی زدہ کر دیا جاتا ہے تو الفاظ اتنے

زیادہ غیر ملکی لگتے ہیں کہ انھیں دیوناگری رسم خط

میں لکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اردو

ہمیشہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور یہی حال

ہندی کے ساتھ ہے جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ کچھ متعصب لوگوں نے اسے مذہبی رخ دے دیا ہے۔ چونکہ ہندوستانی کی یہ دو شکلیں جو الگ الگ رسم خط میں لکھی جاتی ہیں، لسانی تعصب کا شکار ہو گئیں اور ان متعصب لوگوں نے حروف کو زبان کے ساتھ گڈمڈ کر دیا۔ ان لوگوں کے مطابق جو تحریر دیوناگری میں لکھی گئی ہے وہ لازمی طور پر ہندی ہوگی جو ہندوؤں کی زبان ہے اور اگر وہی چیز فارسی رسم خط میں لکھی ہے تو وہ اردو ہوگی جو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان دونوں مفروضوں کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہیں کیونکہ رسم خط زبان نہیں بناتا اور اگر ایسا ہے تو جب ہم ہندوستانی کو رومن رسم خط میں لکھتے ہیں تو اسے انگریزی سمجھنا چاہئے نہ کہ ہندوستانی۔ یہ متعصب لوگ ان دلیلوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دراصل حروف تہجی کے سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسی کو غلط طریقے سے سمجھا گیا۔ جب اس لپی کا اعلان

ہوا کہ کچھ جگہوں پر سرکاری طور پر دیوناگری کا
استعمال کیا جا سکتا ہے تو بہت ہنگامہ ہوا جس نے
بہت سے سمجھدار مسلمانوں کو گمراہ کر دیا کہ اب ہندی
کو سرکاری زبان کے طور پر لادا جا رہا ہے۔ اس
معاملے میں حکومت جانتی تھی کہ سنسکرت زدہ
اور فارسی زدہ اردو عوام کی سمجھ سے باہر ہوں گی
اس لئے کسی کو کوئی سرکاری حیثیت نہیں دی گئی۔
اسی لئے حکومت نے یہ تاکید کی ہے کہ سرکاری
کاغذات بغیر زبان تبدیل کئے اس طرح لکھے جائیں
جو ان لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آ جائے جو
پڑھنے والے ہیں۔

ہندوستانی کی قواعد پر بحث
کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ تمام ہند آریائی بولیوں کی طرح
یہ بھی قدیم ہندوستانی بولیوں سے وجود میں آئی ہے۔
ان قدیم بولیوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جس کی
مثالیں دو سو پچاس قبل مسیح سے لیکر ایک ہزار عیسوی
تک ملتی ہے۔ جہاں تک صرف و نحو کا تعلق ہے
اردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ کبھی

کبھی اردو میں فارسی ترکیبوں میں اضافتیں مستعار ہوتی ہیں لیکن یہ صرف کسی خاص سیاق وسباق یا مخصوص اسلوب کی حد تک ہے ۔ ذخیرۂ الفاظ کے فرق کے علاوہ ہندوستانی کی ان دو قسموں میں محاوروں کا بھی فرق دیکھنے کو ملتا ہے ۔ ہندی میں الفاظ کی ترتیب طے اور کبھی بدل جا سکتی ہے جہاں کسی خاص چیز پر زیادہ زور ہوتا ہے ۔ اردو میں فارسی کی قربت نے بہت سے قواعد آسان بنا دیے ہیں ۔

وہ ہندوستانی کے خزانۂ الفاظ کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے :

۱. خالص ہندوستانی الفاظ

۲. سنسکرت سے مستعار الفاظ

۳. فارسی سے (عربی سمیت) مستعار الفاظ اور

۴. دوسرے ذرائع سے مستعار لیے گئے الفاظ ۔

جہاں تک فارسی اور عربی الفاظ

کا تعلق ہے مسلمانوں سے قبل کی قدیم فارسی کے الفاظ
نہیں بلکہ عربی سے متاثر مغل حکمرانوں کی فارسی سے
زیادہ قریب ہیں۔ اس طرح ہند آریائی زبانوں نے
فارسی کے علاوہ عربی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے
اور کچھ حد تک ترکی الفاظ بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔
اس کے علاوہ اسلام نے عربی کے لئے دروازے
کھول دئے اور عرب تاجروں کے ذریعے بھی کچھ الفاظ
ہندوستانی میں شامل ہوئے۔ گریرسن کے مطابق تمام
ہندوستانی زبانوں میں عربی کے جو بھی الفاظ آئے
ہیں وہ زیادہ فارسی کے ذریعے آئے ہیں۔

سنسکرت الفاظ کی دو شکلیں
ہیں ایک وہ جو سیدھے سنسکرت لغت سے
اسی شکل میں لے لئے گئے ہیں۔ ایسے الفاظ کو
تت سم اور وہ الفاظ جن کی شکل بدل دی گئی
ہے انھیں تدبھو کہتے ہیں۔ خالص ہندوستانی
میں ایسے الفاظ زیادہ جن کی شکل تدبھو ہے اور یہی
زبان کی بنیاد ہیں۔

# HINDŌSTĀNĪ SKELETON GRAMMAR.

## I.—NOUNS.

**(a) *Masculine.***

(1) *Tadbhavas* in *ā*—

| | Sing. | Plur. |
|---|---|---|
| Nom. | *ā* | *ē* |
| Obl. | *ē* | *ō̃* |

*Tadbhavas* in *ā*, which are nouns of relationship, and a few others, do not change, except in the oblique plural. Thus, *chāchā*, an uncle; *lālā*, a master. In short, they follow No. 2.

(2) Others—

| | Sing. | Plur. |
|---|---|---|
| Nom. | — | — |
| Obl. | — | *ō̃* |

**(b) *Feminine.***

(1) In *ī*

| | Sing. | Plur. |
|---|---|---|
| Nom. | *ī* | *iyā̃* |
| Obl. | *ī* | *iyō̃* |

(2) Others—

| | Sing. | Plur. |
|---|---|---|
| Nom. | — | *ē̃* |
| Obl. | — | *ō̃* |

**Postpositions—**

| | | |
|---|---|---|
| Direct | Nom. | — |
| | Acc. (1) | — |
| Oblique | Acc. (2) | *kō* |
| | Agent | *nē* |
| | Instr. | *sē* |
| | Dat. | *kō, kē-liyē* |
| | Obl. | *sē* |
| | Gen. | *kā, kē, kī* |
| | Loc. | *mē̃, par.* |

**Adjectives—**

(1) Masc. *Tadbhavas* in *ā*. Masc. *ā* (Obl. Sing. and Plur. *ē*). Fem. *ī*.

(2) Others do not change.

## II.—PRONOUNS.

| | | (a) Personal. | | (b) Demonstrative. | | (c) Relative. | (d) Correlative. | (e) Interrogative. | | (f) Indefinite. | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | | 1st | 2nd | This | That | Who | That | Masc. Fem. | Neut. | Any one. | Anything. |
| Dir. | Sing. | *maĩ* | *tū̃* | *yah, yeh, yih* | *wah, wōh, wuh* | *jō* | *sō* | *kaun* | *kyā* | *kōī* | *kuchh* |
| | Plur. | *ham* | *tum* | *yah, yeh, yih* | *wah, wōh, wuh* | *jō* | *sō* | *kaun* | — | — | — |
| Obl. | Sing. | *mujh* | *tujh* | *is* | *us* | *jis* | *tis* | *kis* | *kāhē* | *kisī* | — |
| | Plur. | *ham* | *tum* | *in* | *un* | *jin* | *tin* | *kin* | — | — | — |

## III.—VERBS.

**(A) Regular, Transitive and Intransitive.**

| | | |
|---|---|---|
| Infinitive. | Root | + *nā*. |
| Verbal noun. | „ | + — (obl. *ē*). |
| Pres. Part. Act. | „ | + *tā*. |
| Past Part. Pass. | „ | + *ā*. |
| Fut. Part. Pass. | „ | + *nā*. |
| Conjunctive Part. | „ | + *kē*, *kar* or *karkē*. |
| Noun of Agency. | „ | + *nēwālā*, *-nēhārā*. |

*Radical tenses*—

| | | |
|---|---|---|
| Pres. Conj. | Root | + Personal endings. |
| Fut. Ind. = Pres. Conj. | „ | + *gā*. |

*Participial tenses*—

Past Ind. = Past Part.
Past Conj. = Pres. Part.

*Periphrastic tenses*—

| | | |
|---|---|---|
| Pres. def. | Pres. Part. | + *hū̃*, etc. |
| Imperf. | „ | + *thā*. |
| Perf. | Past Part. | + *hū̃*, etc., (intr.) or *hai* (tr.). |
| Plup. | „ | + *thā*. |

And many others.

*Personal endings*—

| | 1 | 2 | 3 |
|---|---|---|---|
| Sing. | *ū̃* | *ē* | *ē* |
| Plur. | *ē̃* | *ō* | *ē̃* |

*Construction*—

Transitive verbs. All tenses formed from Past Part., either passive or impersonal.
Other tenses active.
Intransitive verbs. Active throughout.

*Passive.*—Past Part. Pass., + the proper tense of √ *jā*.

**(B) Auxiliaries—**

(1) √ *hō*, Pres.

| | 1 | 2 | 3 |
|---|---|---|---|
| Sing. | *hū̃* | *hai* | *hai* |
| Plur. | *haĩ* | *hō* | *haĩ* |

(2) √ *th*, Past

| | Sing. | Plur. |
|---|---|---|
| Masc. | *thā* | *thē* |
| Fem. | *thī* | *thī̃* |

(3) √ *hō*, Regular, except in Past. See head (C).

(4) √ *jā*, Regular, except in Past. See head (C).

**(C) Irregular verbs—**

| Infinitive. | Past Part. Pass. |
|---|---|
| (1) *hōnā* | *huā.* |
| (2) *marnā* | *muā.* |
| (3) *karnā* | *kiyā.* |
| (4) *dēnā* | *diyā.* |
| (5) *lēnā* | *liyā.* |
| (6) *jānā* | *gayā.* |
| (7) *ṭhānnā* | *ṭhayā.* |

**(D) Causals and double causals—**

(a) Add *ā* and *wā*, with shortening of root vowel.
(b) Many neuter verbs form Causal by lengthening the vowel.
(c) Irregulars.

| | Causal. | Double causal. |
|---|---|---|
| (1) *chhūṭnā* | *chhōṛnā* | *chhuṛwānā.* |
| (2) *ṭūṭnā* | *tōṛnā* | *tuṛwānā.* |
| (3) *phaṭnā* | *phāṛnā* | *phaṛwānā.* |
| (4) *phūṭnā* | *phōṛnā* | *phuṛwānā.* |

and others.

**(E) Compound verbs—**

(a) From Direct Verbal Noun, Intensives, Potentials, Completives.
(b) From Oblique Verbal Noun, Frequentatives, Desideratives.
(c) From Oblique Infinitive, Inceptives, Permissives, Acquisitives.
(d) From Oblique Pres. Part. Act., Continuatives, Statisticals.

گریرسن "دکنی" کو "مسلمانی" بھی

کہتا ہے — زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

مسلمان افواج نے دکن میں اپنے ہم مذہب لوگوں

میں اپنی زبان شروع سے ہی عام کی — دکن

میں چاہے علاقائی زبان مراٹھی، تامل، تلگو

یا کوئی دراوڑی زبان رہی ہو، مسلمان حکمرانوں

نے ہندوستانی کی دکنی شکل پر زیادہ زور دیا۔

اس کا دعویٰ ہے کہ دکن میں ہی ہندوستانی کی

اردو شکل نے ولی اورنگ آبادی کے یہاں ایک

ادبی حیثیت پائی —

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ دکنی

ہندوستانی کا بگڑا ہوا روپ ہے — لیکن تاریخی اعتبار

سے ادبی ہندوستانی دکنی کا ایک بگڑا ہوا روپ

ہے کیونکہ ہندوستانی ادب نے دکن میں ہی جنم

لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان حکمراں ہندوستانی

کو اس وقت شمال دکن کی طرف لے گئے جب

اس نے کوئی معیار حاصل نہیں کیا تھا اور ایسے

بہت سے الفاظ اور محاورے تھے جو بعد میں متروک

قرار دئے گئے ۔

۱۸۹۱ء کی رائے شماری کی بنیاد
پر دکنی بولنے والوں کی تعداد مندرجہ ذیل چارٹ کے
ذریعے پیش کی گئی ہے:

Table showing the approximate number of speakers of Dakhini Hindustani:

| | |
|---|---|
| Berar | 274,102 |
| Bombay City | 94,493 |
| Thana | 24,821 |
| Kolaba | 5,932 |
| Ratnagiri | 25,867 |
| Kanara | 18,627 |
| Khandesh | 117,844 |
| Nasik | 47,977 |
| Ahmadnagar | 48,847 |
| Poona | 57,669 |
| Sholapur | 56,669 |

| | |
|---|---|
| Satara | 40,781 |
| Belgaum | 76,950 |
| Dharwar | 101,216 |
| Bijapur | 79,999 |
| Feudatories | 254,282 |
| | 1,051,912 |

Central Provinces:

| | |
|---|---|
| Nagpur | 41,616 |
| Wardha | 14,836 |
| Chanda | 10,939 |
| Bhandara | 11,685 |

Madras:

| | |
|---|---|
| British Territory | 817,146 |
| Native States | 17,707 |
| | 834,853 |
| Nizam Dominions | 1,198,382 |
| Mysore | 208,928 |
| Coorg | 6,919 |
| | 3,654,172 |

آگے کے صفحات میں اس نے
بڑی تفصیل سے قواعد اور صرف و نحو پر بحث کی ہے
اس نے ہندوستانی کی کئی قسمیں بتائی ہیں جن میں
ایک ملکی ہندوستانی (Vernacular Hindustani) کا
بھی ہے۔ اسے وہ مغربی ہندی کی ایک بولی قرار دیتا
ہے جو مغربی روہیل کھنڈ، دوآبہ اور انبالہ کے پنجاب
ضلع میں بولی جاتی ہے۔ ملکی ہندوستانی سے ہندوستانی
کی ایسی شکل مراد ہے جس پر دہلی میں رواج پانے
والی ادبی ہندوستانی مبنی ہے۔

اس کے بعد گریرسن نے بانگڑو،
جاٹو، ہریانوی اور برج بھاشا پر تفصیلی بحث کی ہے۔
ساتھ ہی قنوجی اور بندیلی پر بھی بحث کی ہے اور ان
تمام بولیوں کی قواعد، علامتوں اور ذخیرۂ الفاظ کا باقاعدہ
جائزہ لیا ہے۔ اس علاوہ پچھلے صفحات پر ہندوستانی
پر بحث کے سلسلے میں اس نے زبان کے تحریری
نمونے پیش کئے ہیں۔ پہلی مثال ٹھیٹھ ہندوستانی کی
ہے جس میں مصنف نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ کس
طرح اسے دونوں طاقتوں (فارسی اور دیوناگری) سے

لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ فیعسٹھ ہندوستانی آئی کے مضمون میں اس نے لکھا ہے کہ اس میں کچھ الفاظ غیر ملکی زبانوں کے ہونے کے باوجود اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ اسی زبان کے ہو گئے ہیں اور ایسا نہیں لگتا کہ باہر کے اور بھرتی کے الفاظ ہیں۔ اس ضمن میں اس نے مہامہو پادھیائے، پنڈت سدھاکر دویدی، انشاءاللہ خاں انشا اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیائے کی تخلیقات کے نثری نمونے پیش کئے ہیں۔ ساتھ ہی لکھنؤ کی معیاری اردو، لکھنؤ کی دیہاتی اردو، لکھنؤ کی بیگماتی اردو، اور دہلی کی معیاری اردو کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد رومن رسم خط میں معیاری اردو کے نمونے دہلی کی جدید اردو کے نمونے اور پھر مجموعی طور پر اردو شاعری پر بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک اردو کی کلاسیکی شاعری کا تعلق ہے، گریرسن سب سے پہلے میر کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے سراج الدین خاں آرزو کو

نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ شیکسپیئر کی مرتب کردہ منتخبات ہندی سے میر کی شاعری کے نمونے مع ترجمے کے پیش کئے گئے ہیں۔ جدید اردو شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے وہ حالی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حالی کو نثر و نظم دونوں میدانوں میں عظمت حاصل ہے۔ اسی ضمن میں نذیر احمد کا بھی ذکر کرتا ہے۔

دکنی کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس نے اس کے بھی نمونے پیش کئے ہیں۔ مثلاً بمبئی کی دکنی اور مدراس کی دکنی۔ ان نمونوں کو پہلے کی طرح ترجمہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

# گراہم بیلی
## (تاریخ ادب اردو)

گراہم بیلی کی یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ لندن سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شُمیت پبلیکیشنز سے چھپا۔ یہ کتاب ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات پر مشتمل ہے جسے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

زبان کی تاریخ اور تعریف سے پہلے مصنف نے دیباچے میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ تاریخ لکھتے وقت اس نے تذکروں کو بنیاد بنایا ہے اور دیگر دشواریوں جیسے مختلف مخطوطات کا نہ ملنا اور اصل متن کے تعین کی دقتوں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

تاریخ ادب کا آغاز کرنے سے پہلے اس نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کی تعریف بھی کی ہے کیونکہ اس کا قاری اردو داں طبقہ نہیں بلکہ

وہ لوگ ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔
زبان کی ابتدا اور ارتقا کا ذکر
کرتے ہوئے پہلے اس نے مختصر الفاظ میں اردو زبان
کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اردو" ترکی زبان
کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا کیمپ کے
ہیں۔ اس قول کو وہ مثالوں کے ذریعے ثابت کرتا
ہے۔ وہ اردو کا رشتہ ۱۱۹۳ء اور اس کے بعد دہلی
میں مقیم مسلمانوں کی فوج سے جوڑتا ہے کیونکہ اسے
بھی اردو یا اردوئے معلی کہا جاتا تھا۔ وہ یہ نہیں
مانتا کہ فوج کی زبان فارسی تھی اور عوام برج بھاشا
بولتے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ دہلی کے لوگ کھڑی
بولی بولتے تھے جو ہندی کی ابتدائی شکل ہے۔ یہاں
وہ اپنے اس خیال کی تشریح نہیں کرتا۔
اس کے خیال میں ۱۰۲۷ء میں
محمود غزنوی کا پنجاب میں داخل ہونا اردو زبان کی
ابتدا کے سلسلے میں اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔
وہ کہتا ہے کہ اس وقت البیرونی (۹۷۳ - ۱۰۴۸ء)
یہیں مقیم تھا اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کر کے ہندو

مذہب سے متعلق تحقیقات میں مصروف تھا۔
۱۱۸۶ء میں محمد غوری کا حملہ ہوا اور ۱۱۹۳ء
میں قطب الدین ایبک دہلی پر قابض ہوا جو ترک
تھا اور جس نے ۱۲۰۶ء میں سلطان ہونے کا اعلان
کیا۔

ان حقائق کی روشنی میں بیلی نے یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدا ۱۰۲۷ء
سے ہوئی جب پنجاب میں مقیم وہ فوجی جو باہر
سے آئے تھے اور علاقائی اثرات قبول کرتے ہوئے
پنجابی اردو بولنے لگے تھے۔

اس طرح بیلی کے خیال سے اردو کی ابتدا
پنجاب سے ہوئی۔ اس نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس
کا ماخذ، بنیاد یا دلائل پیش نہیں کئے۔ صرف مندرجہ
بالا حقائق سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا۔

پنجاب میں اردو زبان کی بنیاد
قائم کرنے کے بعد اور قطب الدین ایبک کی حکومت
کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس وقت سے
شہر کے چاروں طرف غیر ملکی افواج تعینات ہونا

شروع ہوئیں جن کی زبان ظاہر ہے ہندوستانی تھی۔
اس کا یہ خیال ہے کہ اردو دہلی میں پھولی پھلی لیکن یہ
نہیں بھولنا چاہئے کہ فارسی گو فوجی لوگ پنجاب میں
داخل ہونا شروع ہوئے اور یہیں رہنا شروع کیا۔
یہ بات دہلی پر پہلی سلطنت قائم ہونے کے دو
سو سال پہلے کی ہے اور اس طرح جو کچھ بھی دہلی میں
ہوا صدیوں پہلے اس کی بنیاد لاہور میں پڑ چکی
تھی۔ بلاشبہ ان لوگوں نے یہاں کے باشندوں
کے ساتھ شادیاں بھی کی ہوں گی اور کچھ عرصے
بعد یہاں کی زبان بولنا سیکھ گئے ہوں گے اور
زبان پر فارسی زبان کی چھاپ بھی پڑی ہوگی۔
وہ کہتا ہے کہ ہم سوچ سکتے ہیں کہ ان حالات
میں کیا ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے فوجی لوگ اور عام
باشندے روز ملتے رہتے ہوں گے اور اس کے
لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت پیش آئی
ہوگی۔ یہ زبان یا تو فارسی ہو سکتی تھی یا
قدیم پنجابی۔ چونکہ پنجابی بولنے والوں کی
تعداد زیادہ تھی اس لئے دوسرے دوسرے

فارسی کا زوال شروع ہوا اور یہ صرف دربار و دفاتر تک محدود ہوکر رہ گئی۔

دہلی اور لاہور میں وہی ہو رہا تھا جو انگلستان میں نارمن کی فتح کے بعد شروع ہوا۔ نارمن جو فرانسیسی کی ایک بولی بولتے تھے انھوں نے ایک اینگلو سیکسن ملک میں فرانسیسی کو دربار کی زبان بنایا حالانکہ انھوں نے مفتوح ملک کے گہرے اثرات قبول کئے۔ اور تین صدیوں کے بعد آج وہاں (انگلستان) کی زبان انگریزی ہے۔ بیلی کا خیال ہے کہ ایسا ہی اردو زبان کے ساتھ ہوا لیکن اسے ثابت کرنے کے لئے وہ ٹھوس ثبوت نہیں لاتا۔

دہلی پر قطب الدین کی حکومت قائم ہونے کے بعد بیلی کا خیال ہے کہ یہاں کے لوگوں نے کوئی ایسی زبان بولنی شروع کی ہوگی جو اردو سے بہت نزدیک ہو سکتی ہے اور اس کی بنیاد پنجابی ہے جس نے پراکرت سے جنم لیا اور جو کھڑی بولی سے اس قدر مختلف نہیں ہو سکتی جتنا

فرق آج نظر آتا ہے ـــــ بیلی کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ اردو نے دہلی میں نہیں بلکہ لاہور میں جنم لیا جہاں کھڑی بولی نہیں بلکہ قدیم پنجابی تھی بیلی نے ادب کے ادوار کی تقسیم کرتے وقت اس کی بنیاد تاریخی اور علاقائی رکھی ہے اور ساتھ مذہبی پہلو بھی نظر انداز نہیں کرتا ـــــ

تیسرے باب میں ادبی تقسیم میں پہلے دور کے پہلے حصے میں ۱۵۹۰ء ـ ۱۳۵۰ء تک کا ذکر کیا ہے اور اس کی بنیاد مذہب بتائی ہے جس میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شیخ عین الدین گنج العلم، عبداللہ حسینی، شاہ میراں جی اور شاہ برہان وغیرہ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے ـ

دوسرے حصے میں ۱۷۳۰ ـ ۱۵۹۰ء تک کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے اور اس حصے میں صرف دکن کے ادبی کارناموں سے بحث کی گئی ہے ـ

اس دور کو اس نے قطب شاہی دور کہا ہے جس میں قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، رستمی، نصرتی، ولی اور سراج کو شامل کیا ہے ـ ان تمام

شعراء کے مختصر حالات زندگی اور کلام کے ادبی نمونے
بھی پیش کئے ہیں — ان ادبی نمونوں کے ماخذ اور
اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔

دوسرے ادبی دور کو دہلی میں
اردو شاعری کی پہلی صدی کا نام دیا گیا ہے اور ۱۷۲۳ء
سے ۱۸۱۳ء تک کا احاطہ کیا گیا ہے — اس دور کو
تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے:—

الف: حاتم کا دور جس میں صوفی
شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔

ب: مظہر، سودا، میر اور درد
کا دور۔

ج: مصحفی، انشا اور نظیر کا دور۔

الف:

حاتم کے دور کا ذکر کرتے ہوئے وہ
دو اہم شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے — وہ ہیں افضل اور
جعفر زٹلی — ان کے علاوہ جن دوسرے شعراء کا ذکر
کیا ہے ان میں احمد، آبرو، یکرنگ اور حاتم اہم ہیں۔
اس نے صرف جعفر زٹلی اور احمد کے ادبی نمونے پیش

گئے ہیں — باقی لوگوں کے ادبی نمونے نہ پیش کرنے
کی کوئی وجہ نہیں بتائی اور جن لوگوں کی نظمیں
ترجمہ کرکے پیش کی ہیں ان کے ماخذ اور سبب
کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔

ب:

اس حصّے کو اس نے "اردو کے
چار ستون کا دور" کا نام دیا ہے جن میں مظہر، سودا
میر اور درد کو شامل کیا ہے۔ اس نے ان شعراء کے
حالات زندگی لکھے ہیں لیکن ان کے ادبی نمونے پیش
نہیں کئے۔

ج:

اس حصّے میں بھی اس نے مصحفی،
انشا، حسرت، جرأت، رنگین، یقین، اثر، ہدایت
قدرت، ضیاء، نظیر اور ناصر وغیرہ کے مختصر حالات
زندگی بیان کئے ہیں — نہ ہی ان ماخذ کی طرف اشارہ
کیا ہے اور نہ ہی ان شعراء کا کوئی انتخاب پیش کیا
ہے۔

چوتھے باب میں بیلی نے لکھنؤ میں

انیسویں صدی کی اردو شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں اس نے بہت ہی مختصر تاریخی حالات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف شعراء کے حالات زندگی پیش کئے ہیں اور اس دور کی مخصوص صنف اس نے مرثیے کو قرار دیا ہے اور انیس و دبیر کے مرثیوں کو بنیاد بنایا ہے۔ لیکن اس نے مراثی کا کوئی انتخاب نہیں پیش کیا۔ اس دور کے اہم شعراء میں خالق، ضمیر، شاہدی، نسیم، ناسخ، آتش، رند، رشک، برق، مہر، بحر، خلیل، ابد، اختر، اسیر، قلب، ذکی، درخشاں، امانت، مونس، شوق، عشق، نفیس اور عارف وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام شعراء کے بارے میں مختصر نوٹ دئے گئے ہیں جن کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا۔

پانچویں باب میں دہلی میں اردو شاعری کا دوسرا دور اور رامپور کے چار شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں ذوق، غالب، بہادر شاہ ظفر، اصغر علی خاں نسیم، تسکین، شیفتہ، آزردہ، سالک، ضیاء، ثاقب، ذکی،

ظہیر الدین ظہیر، مرزا انوار اور میر مہدی مجروح پر نوٹ لکھے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں داغ اور ضامن علی جلال، امیر مینائی اور تسلیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں کبھی شعراء کے کلام کے نمونے پیش نہیں کئے۔ صرف چند مشہور خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں اردو نثر پر بحث کی گئی ہے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ اردو کے ابتدائی نثر نگاروں سے متعلق ہے جس میں جعفر زٹلی کی نثر کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ زٹلی کی نثر میں روانی ہے اور آسان فطری زبان کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے بعد فضلی کی تصنیفات اور ~~محمد حسین~~ محمد حسین کلیم، سودا، محمد عطا حسین تحسین وغیرہ کی تصانیف کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔

دوسرے حصے میں فورٹ ولیم کالج کے ان کارناموں کا ذکر ہے جو ترجموں کی شکل میں سامنے آئے۔ اس حصے میں گل کرسٹ کا خصوصی ذکر کرتے

ہیں مرزا علی لطف، سید حیدر علی بخش حیدری، میر امن، بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، حفیظ الدین احمد، نہال چند لاہوری، للو لال، کاظم علی جوان، مظہر علی ولا، اکرام علی، امانت اللہ شیدا اور بینی نرائن وغیرہ کے حالات و تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں انیسویں صدی کے اردو نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں مولوی اسمٰعیل شاہ رفیع الدین، خلیل اللہ خاں اشک، مرزا جان طپش، انشاء اللہ خاں انشا، رنگین، گویا، رجب علی بیگ سرور، غالب، غلام امام شاہد، رام چندر، عبدالکریم سرسید احمد خاں، غلام غوث بے خبر، امیر مینائی، محمد حسین آزاد، چراغ علی، الطاف حسین حالی، محسن الملک، شبلی نذیر احمد، سرشار، شرر، ذکاء اللہ، سجاد حسین وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات درج ہیں۔

ساتواں باب دور جدید پر مشتمل ہے جس میں حالی، سرسید احمد، اکبر اور آزاد کی تصانیف اور حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ حالی کے مسدس سے چند ادبی نمونے پیش کر کے اس دور کے ادبی رجحان

کا تجزیہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے —

# گارساں دی تاسی

گارساں دی تاسی کی ہندوستانی ادب کی تاریخ دو جلدوں میں پہلی بار ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی دوسری اشاعت ۷۱-۱۸۷۰ء میں ہوئی جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

دی تاسی کے مطابق سولہویں صدی تک جدید ہندوستانی زبانوں نے سماج میں اپنا اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور ویدوں کی مقدس زبانوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس زمانے میں ایسی زبانوں کو بھاشا یا بھاکھا اور خصوصاً "ہندوی" یا "ہندوئی" کے نام سے پکارا جاتا تھا لیکن محمود غزنوی کے حملے تک اس نئی زبان کی مکمل شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ستر ھویں صدی کے آخر میں دلّی میں پٹھانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوؤں اور ایرانیوں کے آپسی میل جول کی وجہ سے غالب اور مغلوب زبانوں کی ایک

ملی جلی شکل وجود میں آئی ۔ دہلی پر تیموری حکومت کے دوران اس میل جول نے اور مستحکم شکل اختیار کر لی ۔ افواج کے لئے بازار شہر میں قائم کئے گئے تھے جسے تاتاری زبان میں "اردو" کہتے تھے ۔ یہیں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ایک نئی زبان کی ابتداء ہوئی اور یہیں سے اسے اردو زبان کہنے کی روایت شروع ہوئی ہے ۔ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اسے "ریختہ" کہتے تھے ۔ اسی زمانے میں جنوبی ہندوستان میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک نئی ملی جلی زبان نشوونما پا رہی تھی جسے "دکھنی" کا نام دیا گیا ۔ ان دونوں بولیوں نے ہندوستان میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی ۔ حالانکہ الفاظ کے انتخاب کے اعتبار سے دونوں بولیوں میں فرق ہے لیکن زبان کی ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور یہ "ہندی" یا "ہندوی" جیسے بہت ناموں سے اور خصوصاً یورپی علماء کے درمیان "ہندوستانی" کے نام سے پکاری جاتی ہے ۔ طرز تحریر یا رسم خط مقام اور

شخصیت کے اعتبار سے الگ الگ ہے اور زیادہ تر فارسی رسم خط کا استعمال ہوتا ہے لیکن ہندو اپنے بزرگوں کی طرح دیوناگری طرزِ تحریر اختیار کرتے ہیں۔

وہ بول چال کی زبان کے طور پر "ہندوستانی" کو سارے ایشیا میں ایک شائستہ زبان مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فارسی کی ایک کہاوت کے مطابق مسلمان عربی کو مشرقی مسلمانوں کی زبان کی بنیاد پر ایک مکمل زبان کے روپ میں، ترکی آرٹ اور آسان و سلیس ادب کے روپ میں فارسی کو فنون لطیفہ، تاریخ اور معیاری خط و کتابت کی زبان کے روپ میں مانتے ہیں۔

دی تاسی کہتا ہے کہ ہندوستان میں جو زبان سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں ادبی ثروت اور شائستگی اور عام مقبولیت پائی جاتی ہے وہ ہندوستانی ہی ہے۔ اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ زبان روز ایک نئی جہت سے روشناس ہوتی ہے۔

دفتروں اور عدالتوں میں اس نے فارسی کی جگہ حاصل
کرلی ہے اور یقیناً جلد ہی سیاسی میدان میں بھی
اپنا مقام حاصل کرلیگی ـ

دی تاسی کے مطابق "ہندوستانی"
ایک ایسی زود ترقی یافتہ زبان ہے جس نے کچھ ہی
عرصے میں ہر میدان میں اپنی دھاک جمالی ہے ـ
جس طرح یورپ میں عیسائی اصلاح پسند نے
اپنے خیالات کی تبلیغ کے لئے اس زمانے کی
زندہ زبانوں کو ذریعہ ترسیل بنایا، اسی طرح
ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب
کے عظیم اصلاح پسندوں اور مبلغین نے اپنے
خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے ہندوستانی کا
استعمال کیا ـ ان بزرگوں میں کبیر، نانک، دادو،
دیر کھان، بختاور اور سید احمد جیسے لوگ اہم
ہیں ـ ان کی تصانیف ہندوستانی میں ہیں اور ساتھ
ہی ان کے ماننے والے اسی زبان کا استعمال
کرتے ہیں ـ

ہندوستانی ادب کا اپنا ایک الگ

مقام ہے جو کسی دوسری زبان کے ادب سے کسی طرح
کمتر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادب میں
ایک طرح کے اپنے پن کی کیفیت ہوتی ہے جو اسے
دلکش بناتی ہے اور یہ خصوصیت ہندوستانی میں بھی
پائی جاتی ہے۔ دی تاسی ہندوستان کو فن شاعری
کے معاملے میں بہت مقبول ملک سمجھتا ہے۔
یہاں کی تمام قدیم ادبی داستانیں، تاریخ،
اخلاقی قصے اور لغات وغیرہ شاعرانہ انداز میں
ملتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستانی ادب کا ایک بہت
بڑا حصہ فارسی سنسکرت اور عربی سے ماخوذ ہے
لیکن یہ فن پارے ان سے الگ اپنا وجود رکھتے
ہیں۔

"ہندوی" کی روایت بارہویں
صدی سے شروع ہوتی ہے اور جنوب کے مسلمان
مصنفین کی تیرہویں صدی سے۔ لیکن اس زبان و
ادب نے باقاعدہ مقبولیت اٹھارویں صدی میں
حاصل کی۔ اس زبان کو مقبولیت دینے والوں میں
سودا، میر اور میرحسن شامل ہیں۔ اور دکنی کا

رواج سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ہندوستانی

کی جن مشہور تخلیقات کا ذکر کرتا ہے ان میں میر

کی "نکات الشعرا"، مصحفی کی "تذکرۂ شعرائے ہندی"

فتح علی حسینی کی "تذکرۂ شعرائے ہندی" نواب علی

ابراہیم خاں کی "گلزار ابراہیم" لطیف کی "گلشن

ہند" بینی نرائن "دیوان جہاں" اور منولال کی "گل دستۂ

نشاط" شامل ہیں۔

ہندوستانی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے

وہ کہتا ہے کہ اس پر فارسی اور عربی کے اثرات

حاوی ہیں کیونکہ اس میں عروض کی وہ ساری پابندیاں

ملتی ہیں اور ساتھ ہی قافیہ و ردیف کی وہی بندشیں

اس میں پائی جاتی ہیں۔ ریختہ میں شاعری کے مختلف

انداز بیان کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

۱۔ ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی

میں لکھا جا سکتا ہے جیسا کہ خسرو کی شاعری میں

دیکھنے کو ملتا ہے۔

۲۔ اس کا الٹا یعنی پہلا مصرع ہندی

اور دوسرا فارسی میں لکھا جا سکتا ہے جس کی مثال میرزا معز

کے یہاں ملتی ہے۔

۳۔ فارسی الفاظ کا استعمال ہندوستانی سیاق و سباق میں۔

آگے چل کر وہ ادب کی مختلف اصناف کا بھی ذکر کرتا ہے جن میں قصیدہ، ہجو، قطعہ اور خیال، غزل، چیستاں، بیان، تذکرہ، تضمین، ترانہ تشبیب، تعریف وغیرہ شامل ہیں اور ان کی تعریفیں بھی بیان کرتا ہے ساتھ ہی نکتہ، فرد، بند، بیاض، بیت، دوبیتی، چاربیت، منقبت، مرثیہ، مثنوی، پندنامہ، مخمسہ، مبارک باد، مسمط، مولود، رسالہ، رباعی، واسوخت، شکارنامہ، سلام، سرود، ساقی نامہ، سوز، ہزلیات کی بھی تعریفیں پیش کرتا ہے۔

مختصراً ہندوستانی ادب کی تاریخ گارساں دی تاسی کے مطابق دس سو عیسوی (۱۰۰۰ء) کو محمود غزنوی کے حملے سے ہموار ہونی شروع ہوتی ہے اور چار صدی بعد جب دہلی پر مغلوں کی حکومت قائم ہوئی ہے تب تک اس زبان نے خود کو مختلف زبانوں کے الفاظ سے مالا مال کر لیا تھا۔

رسم خط کے دی تاسی کا خیال ہے کہ
جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان پر قائم رہی
سارے ہندوستان میں اردو۔ فارسی رسم خط کے ذریعے
تعلیم دی جاتی تھی اور بہت دنوں تک انگریزی
سرکار نے یہی پالیسی جاری رکھی۔ ۱۸۳۱ء میں
ہندوستان میں مختلف علاقوں میں مختلف زبانوں کے استعمال
کی وجہ سے مختلف صوبوں میں ان کی علاقائی زبانوں
کو اہمیت دی گئی۔ اردو جنوب اور جنوب مغرب
کے صوبوں میں اپنائی گئی۔ اسے سب نے پسند کیا اور
تیس سال اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔
ہندوستان کی مختلف تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا
ہے اس زمانے میں ہندوؤں کی ایک ایسی تحریک
بھی ابھری جو اردو کے سارے اپنے بند کر دینا چاہتے
تھے۔ فارسی رسم خط ہونے کی وجہ سے ان کا خیال
تھا کہ اس پر مسلمانوں کے اثرات حاوی ہیں۔ اپنی
اس رجعت پرست سمجھ کی وکالت کرتے ہوئے جو دلائل
پیش کئے گئے ہیں انھیں قطعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا
یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہندی اور اردو کی تفریق

وجود میں آچکی تھی۔ ہندی کے حامیوں کی تنقید کرتے ہوئے دی تاسی لکھتا ہے کہ یہ لوگ خود ہی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق اردو باقاعدہ طور پر اپنا ادبی مقام حاصل کر چکی ہے اور سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندو فارسی رسم خط پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت نہیں ہوتے اور شکستہ الفاظ کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے جبکہ بات اس کے برعکس ہے اور ہندی کھسیٹ میں لکھی ہوئی ناگری پڑھنا زیادہ مشکل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے اس چیلنج کو بہت بہادری کے ساتھ تسلیم کیا ہے اور سخت جوابات بھی دئے ہیں۔

اپنی تاریخ ادب میں گارساں دی تاسی نے ہندوستانی ادب کے ارتقاء کا عہد بعہد جائزہ لیا ہے۔ یہ سلسلہ گیارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے مختلف علماء کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تخلیقات کی علاقہ بندی بھی کی ہے۔ مثلاً شمالی ہند کے علماء میں ابو الفضل اور بایزید انصاری اور دکنی ادب میں محمد افضل اور محمد قلی قطب شاہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اٹھارویں صدی کو وہ سب سے زیادہ اہمیت

دبستان ہے جس میں گنگا پرشاد، دیر، کھان، میر، میر حسن، سودا، آرزو، درد، یقین، فغاں، امجد، امین الدین، عاشق غازی پوری وغیرہ کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔

# انا ماری شمل

شمل کے مطابق ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلم مخالف طاقتوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف ایک طرح کا جہاد چھیڑ دیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ہندوستانی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جب ہندوستان پر برطانوی حکومت قائم ہوئی ہے۔ اس سے پہلے مشرقی علوم کی طرف مغرب کے علماء کی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی چاہے وہ ہندوستانی ہو یا فارسی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جو کام ہندوستانی علوم کے میدان میں ہوئے ان کی روشنی میں بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انگریز مقامی لوگوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکے۔ چونکہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کی تخلیق کی حیثیت قطعی مصنوعی تھی اور چند علماء سرکاری طور پر اس کام کو انجام دے رہے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ

ہوگا کہ انگریزوں کو چاہے اور جن میدان میں دلچسپی رہی ہو، اردو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی جو میکالے کے نظریات کی شکل میں ہندوستان میں تعلیمی پالیسی متعین کرتے وقت ہمارے سامنے آئی ہے۔ فارسی جو صدیوں سے انتظامیہ، اعلیٰ تعلیم، تاریخ نویسی اور شاعری کی زبان تھی، اٹھارہ سو سینتس (۱۸۳۷ء) اس کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور ۱۸۴۴ء میں فورٹ ولیم کالج میں اردو کو ذریعہ امتحانات کا درجہ مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ انگریزوں میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو نہ صرف اردو بلکہ تمام مقامی زبانوں اور علوم کی ترقی پر زور دیتا تھا، جس کی اعلیٰ مثال سر بارٹل فریئر (Sir Bartle Frere) ہے جس نے سندھی زبان کو تحریری شکل دی۔ اس کے علاوہ پشتو اور پنجابی کے میدان میں بھی وسط انیسویں صدی میں کافی کام ہوا جن میں ارنسٹ ٹرمپ (Ernst Trumpp) کا نام اہم ہے۔ اس کے علاوہ جوزف وان ہیمر پرگستال (Joseph von Hammer Purgstall) جو سلسلہ

کا رہنے والا تھا اس نے ہندوستانی ادب پر کئی
مضامین لکھے اور یورپی علماء کی توجہ "ہفت قلزم"
کی طرف مبذول کرائی جو ۱۸۱۴ء میں لکھنؤ سے
شائع ہوئی —

ہندوستانی ادب کے میدان میں جن
علماء نے انیسویں صدی میں درحقیقت کوئی
نمایاں کام کیا ہے ان میں فرانسیسی ادب کا
گارساں دتاسی کا نام سرفہرست ہوگا جس نے
۱۸۲۸ء میں پیرس میں ہندوستانی زبان وادب
کی تعلیم دینی شروع کی — اس کے علاوہ
جرمن زبان میں امانت کی اندر سبھا کے
تراجم نے اردو ادب کو یورپ کے لوگوں تک پہنچانے
میں مدد کی — یہ ۱۸۵۳ء میں واجد علی شاہ کے
دربار میں لکھی گئی اندر سبھا کے ترجمے ہیں —

مجموعی طور پر اردو کا دائرہ
بہت محدود تھا اور یونیورسٹیوں میں اس زبان
کی تعلیم کے لئے شعبے کھولنے پر کوئی خاص
دھیان نہیں دیا جاتا تھا — اسی طرح سے

جیسے انیسویں صدی کے پانچویں اعشاریہ سے ۱۹۳۰ء تک
ترکی زبان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا کچھ اسی
طرح کی بے توجہی کا سامنا اردو کو بھی کرنا پڑا۔ یہ
سچ ہے کہ اردو شعراء نے فارسی کے رائج روایتی
انداز کو اپنایا لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ فارسی
سے الگ اردو کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اکثر یہ
بھی کہا گیا ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستانی سماج
کے جو مقامی اثرات نمایاں ہیں وہ اسے فارسی
شاعری سے الگ کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ
ترکی زبان کی طرح اردو نے بھی فارسی کے ذخیرے
سے بہت سے الفاظ مستعار لئے۔ فارسی شاعری
کی طرح اردو شاعری میں بھی وہ صوفیانہ تصورات
وراثت میں ملے لیکن ان کا سیاق وسباق ہندوستانی
تھا۔ اردو شاعری جن عظیم فارسی شعراء کے خیالات
سے متاثر ہوئی ان میں رومی اور عطار کی صوفیانہ
شاعری ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں فارسی
کی طرح عاشق کا کرب اور محبوب سے جدائی مرکزی
خیال ہے۔ اس اسی طرح منصور، شیریں و فرہاد

اور لیلیٰ مجنوں کے قصوں کی تصویر کشی عربی اور
فارسی کی طرح اردو شعراء کے یہاں بھی دیکھنے کو
ملتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو شاعری
میں جو مشترکہ اقدار ہیں ان میں شاعر یا
عاشق کا ناصح یا شیخ سے جھگڑا بھی ہے۔

# رالف رسل

حال ہی میں رالف رسل لندن یونیورسٹی
کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں
ریڈر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ اب
تک ان کے تین تحقیقی مقالے: تھری مغل پوئٹس
(Three Mughal Poets)، ۱۹۶۹ء، غالب لائف
اینڈ لیٹرز (Ghalib: Life and Letters) ۱۹۶۹ء
اور غالب: دی پوئٹ اینڈ ہز ایج (Ghalib
The Poet and His Age) ۱۹۷۲ء کتابوں
کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ سے
گو انھوں نے باقاعدہ اردو ادب کی کوئی تاریخ نہیں
لکھی لیکن اردو ادب کے مختلف ادوار کے مطالعے
کے سلسلے میں ان کے ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر
پر روشنی پڑتی ہے اور مستشرقین کے نقطۂ نظر کی
وضاحت ہوتی ہے۔

Three Mughal Poets کے دیباچے

میں وہ لکھتے ہیں کہ اردو ہند و پاک برصغیر کی
درجنوں یا اس سے بھی زیادہ زبانوں میں سب سے
زیادہ مکمل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک
مخصوص جغرافیائی علاقے کی زبان نہیں۔ گو کہ اس کا
اصل وطن اتر پردیش اور دلی کے آس پاس کے
علاقے ہیں لیکن اردو بولنے والے تمام ہندوستان
اور پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ
اردو بولنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے
لیکن اسے صرف مسلمانوں تک محدود نہیں کیا جا
سکتا اور نہ ہی اسے مذہبی ادب کہا جا سکتا ہے۔
لیکن اردو ادب ان لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی
کرتا ہے جو اسلام مذہب کے ماننے والے ہیں۔
اردو ادب کی جو موجودہ شکل آج ہمارے سامنے
ہے اس کا سلسلہ اوائل اٹھارویں صدی سے شروع
ہوتا ہے۔

برصغیر کی ایک بہت ہی اہم زبان
ہونے کے باوجود ان کے نزدیک اردو ادب انگریزی
بولنے والوں کو بہت زیادہ متاثر نہیں کرتا۔ اس کی

تاریخی وجوہات ہیں ۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت
کی بنیاد پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء کی جنگ سے پڑ
جاتی ہے جو انگریزوں کو باقاعدہ بنگال کا حکمران بنا
دیتی ہے ۔ اس وقت تک میر اور سودا ادبی دنیا
میں ایک مستند مقام حاصل کر لیتے ہیں ۔ لیکن
نصف صدی تک اردو کے اہم مراکز برطانوی حکومت
کی حدبندیوں سے باہر ہوتے ہیں ۔ اور اس وقت
تک محدودے چند انگریز ہی اس سے واقف
ہو پاتے ہیں لیکن انیسویں صدی کے شروع میں
جب انگریزوں کا اقتدار بڑھتا ہے اور دلی پر ان
کی حکومت قائم ہوتی ہے ، اردو کا میدان اور بھی
وسیع ہوتا ہے لیکن پھر بھی حکومت کی طرف سے
اردو کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی ۔

ہندوستانی ادب کو نظر انداز کرنے
کا سہرا میکالے کے سر ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی
ادب بلکہ سارے ایشیائی علوم کو سرے سے بے بنیاد
اور غیر اہم قرار دیا ۔ مقامی زبانوں کو غیر ضروری
بتاتے ہوئے اس نے ان بولیوں کو ضعیف اور

غیر شائستہ قرار دیا۔ یہاں میکالے کے تمام اقوال کا تجزیہ ممکن نہیں لیکن بنیادی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اس رویے سے ہندوستانی ادب کی طرف ایک غیر ہمدردانہ سمجھ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ رویہ وکٹوریائی عہد تک ختم نہیں ہوتا بلکہ ہمارے دور تک بھی جاری ہے جس کے ذریعے انگریزی کو مسلط کرنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ رسل کہتے ہیں کہ یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں ہے بلکہ برطانوی امور خارجہ کے دفتر نے ۱۹۴۴ء میں جو اسکاربرو کمیشن (Scarbrough Commission) مشرقی علوم کے سلسلے میں بٹھایا اس کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کمیشن کی رپورٹ ۱۹۴۷ء میں چھپی، میکالے منٹ کی تنقید کرتے ہوئے اس میں کہا گیا کہ ایسا رویہ جو کسی تہذیب کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتا ہے صحیح نہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تحریک آزادی کے شروع ہو جانے کے بعد برطانوی حکمرانوں کی دو دلچسپی ہندوستانی تہذیب میں ظاہر ہوئے

لگی تھی وہ پھر سے زوال پذیر ہونے لگی کیونکہ اس وقت
ان کی کوشش ادب اور آرٹ کی خدمت نہیں بلکہ اقتدار
بچانے کی طرف منتقل ہوگئی اور جس نے مسلکانہ
خیالات کو تقویت بخشی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس
پورے دور میں انتظامیہ کو بہتر طور پر چلانے کے لئے
اردو کی اہمیت کا احساس کیا گیا۔ لیکن اردو ہندوستانی
فوج کی دلچسپی کا مرکز نہ بن سکی۔

اس دور کے تاریخی پس منظر کا ذکر
کرتے ہوئے رسل اردو ادب کے ارتقائی مراحل کا ذکر
کرتے ہیں اور اس کی عہد بعہد تاریخ کو اہمیت دیتے
ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۵۲۶ء میں بابر کے حملے کے
بعد مغلیہ سلطنت کا قیام وجود میں آتا ہے اور اکبر
کے تخت نشین ہونے تک اس کی جڑیں ہندوستان
میں مستحکم ہو جاتی ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے
باوجود بھی اکبر ادب اور آرٹ کا دلدادہ تھا اور
اس نے اپنے دربار میں ایسے عالموں کی سرپرستی
کی۔ یہ وہ دور ہے جب اردو ایک باقاعدہ زبان کی
حیثیت سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ مختلف غیرملکی

زبانوں کے اثرات سے جو ایک ملواں زبان جنم لے
رہی تھی اس نے نہ صرف عوام بلکہ درباروں کو بھی متاثر
کیا اور مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر
جیسے شاعر کو بھی جنم دیا۔ ظاہر ہے بہادر شاہ ظفر تک
پہنچتے پہنچتے انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا باقاعدہ
قبضہ جمالیا تھا اور دلّی جو اب تک اردو سرگرمیوں کا
مرکز تھی، اس کی وہ حیثیت نہیں رہ جاتی اور اردو
نوابین اودھ کے دربار میں پناہ حاصل کرتی ہے۔
اس کتاب کو مصنف چھ حصوں میں
تقسیم کرتا ہے:

۱۔ اٹھارویں صدی کا پس منظر
(The Eighteenth Century Background)

۲۔ سودا کی ہجویات
(The Satires of Sauda)

۳۔ میر حسن کی سحر البیان
(Mir Hasan's "Enchanting Story")

۴۔ میر کی عشقیہ شاعری
(The Love Poetry of Mir)

۵ - میر اور عاشق کی زندگی
(Mir and Lover's way of Life)

۶ - میر بحیثیت انسان اور ان کا دور
(Mir: The Man and His Age)

پہلے باب میں (اٹھارویں صدی کے پس منظر) میر، سودا اور میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کہتا ہے کہ یہ شعراء ایک ایسے سماج میں رہ رہے تھے جو یورپی دور وسطیٰ سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ اکثریت دہقانوں (peasants) کی تھی اور ایک طرح سماج کی معیشت کا دار و مدار انھیں پر تھا۔ سارے سماج کا ایک طے شدہ نظام ہوتا تھا جس میں سب سے اعلیٰ مقام بادشاہ کو حاصل تھا جس کے ہاتھ میں سارے اختیارات مرکوز تھے۔ ہر خاص و عام کو اس کا وفادار ہونا لازمی تھا۔ بادشاہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے عوام کو تحفظ دے اور ان کے آرام و آسائش کا سامان بہم پہنچائے۔ زمین دار اسے اپنی کاشت کا مقررہ حصہ بطور نذرانہ پہنچائے۔ بادشاہ کے بعد کا مقام امیرزادوں کا تھا جو بادشاہ کے توسط سے

بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔ اس کے بدلے میں جب بھی
بادشاہ کو ضرورت ہوتی تھی، اس کی خدمت کے لئے تیار
رہنا ہوتا تھا۔ خصوصاً ان کا فرض بادشاہ کو وقت
ضرورت فوجی امداد فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے
میں نظریاتی طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایسے سماجی نظام
کے ذریعے ہی عوام کی خوش حالی اور امن کی ضمانت
دی جا سکتی ہے۔ سماج کا ہر فرد زندگی کے ہر ضروری
شعبے میں دخل رکھتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں عشق
اور شادی دو الگ چیزیں ہیں جس کی جھلک
اس زمانے کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔
شعراء کی سرپرستی اس زمانے کے
شرفا باعث فخر کام سمجھتے تھے۔ جو ان کی اعلیٰ سماجی
حیثیت کو اور بلند کرتی تھی۔ چونکہ یہ شعراء ان شرفا
کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے جن کے بدلے وہ
انعام پاتے اور اس طرح وہ اپنے سرپرست کی تعریف
کے پل باندھنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے رہتے
تھے۔ لیکن میر اور سودا و میر حسن ایسے شعراء
میں سے ہیں جن کے یہاں آزادی فکر ہے اور

جیسا وہ محسوس کرتے ہیں اس کی عکاسی اپنی شاعری
میں کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان شعراء کے یہاں
بادشاہوں اور شرفا کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے۔
اس کی مثال سوداؔ کا وہ مشہور قصّہ ہے جس میں بادشاہ
ان سے پوچھتا ہے کہ دن بھر میں کتنے اشعار کہہ لیتے
ہیں۔ سوداؔ جواب دیتے ہیں کہ جب طبیعت موزوں
ہوتی ہے تو تین چار اشعار کہہ لیتا ہوں۔ اس پر بادشاہ
کہتا ہے کہ تین مکمل غزلیں تو میں پاخانے میں بیٹھ کر
کہہ لیتا ہوں۔ سوداؔ نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے اس
میں سے ویسی ہی بو بھی آتی ہوگی۔ اس کے علاوہ
جب بادشاہ کی طرف سے یہ تجویز آتی ہے کہ وہ سوداؔ
کو درباری شاعر بنانا چاہتا ہے تو سوداؔ جواب
دیتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے عطا کیا گیا یہ درجہ
ان شاعری کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے بہت
سے قصّے میرؔ کے بارے میں بھی مشہور ہیں۔

اس زمانے میں شاعری کی تین
اصناف غزل، قصیدہ اور مثنوی اہم ہیں جن میں
غزل کا مقام سب سے بلند ہے۔ یہ اصناف فارسی

سے اردو میں اسی طرح سے آیئں جیسے اطالوی سے انگریزی میں سانیٹ آیا۔

اس دور کا سیاسی اور ~~سماج~~ سماجی پس منظر رسل ۱۵۲۶ء (بابر کے دور سے) کرتے ہیں جب وہ ہندوستان پر حملہ کرتا ہے اور پانی پت کی پہلی لڑائی فتح کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی جڑیں مضبوط کرنے کا سہرا اکبر کے سر ہے جو ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا۔ مصنف نے مغل خاندان کے تمام بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کی رسومات اور ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ لیکن یہ تذکرے ان تین شعراء کی زندگی کے دائرے تک محدود ہیں۔ دوسرے باب میں سودا کی ہجویات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور نثری نمونے مع ترجمہ پیش کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں میر حسن کی زندگی سے متعلق ضروری معلومات و اس دور کے سماج میں مثنوی کے مقام پر تبصرہ کرتے ہوئے سحر البیان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں میر کی عشقیہ شاعری پر بحث

کی گئی ہے جس میں ان کی مشہور مثنویات کو سامنے رکھا
گیا ہے - ان میں دریائے عشق کا ذکر خصوصی طور پر
کیا ہے اور کلام کے نمونے مع ترجمہ پیش کیے گئے
ہیں - پانچویں باب میں میر کی شاعری میں عاشق
کی زندگی اور اس کے مقام کا ذکر کیا گیا ہے -
یہاں مصنف عشق مجازی اور عشق حقیقی کا
ذکر کرتا ہے - وہ کہتا ہے کہ میر کی شاعری کی
بنیاد عشق حقیقی پر ہے اور اس طرح ان کی شاعری
کا عاشق وہ ہے جو خدا کی بے پناہ محبت میں
گرفتار ہے - چھٹے باب میں میر کی شخصیت اور
دور کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے
کی کوشش کی گئی ہے کہ میر کی شاعری کا دارومدار
رنج و الم پر ہے -

# ڈیوڈ میتھیوز اور سی شیکل

(D.J. Matthews and C. Shackle)

ڈیوڈ میتھیوز اور سی۔ شیکل لندن
یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز
میں اردو کے استاد ہیں ۔ گو انھوں نے باقاعدہ
اردو ادب کی تاریخ نہیں لکھی لیکن اپنی تصنیف ، An
Anthology of Classical Urdu Love Lyrics
میں اردو شاعری کے کلاسیکی سرمائے پر بحث کرتے
ہوئے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان سے ان کے تاریخی
شعور اور رویے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز اور شیکل اردو ادب
میں غزل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور
یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ
لکھنے والوں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے

ان کے نزدیک غزل کی ابتدا
عباسیہ دور سے ہوتی ہے اور یہ ادوار غزل کو

ابو نواس (Abu Nuwas) ہے جس نے ۸۱۳ء میں انتقال کیا۔ گو کہ غزل کی روایت عربی شاعری سے شروع ہوتی ہے لیکن اسے سب سے زیادہ فروغ فارسی ادب نے دیا اور آج بھی غزل اسی فارم میں لکھی جاتی ہے۔

جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے
چونکہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دور میں فارسی ادبی زبان تھی، اس لئے ہندوستانی زبان میں اس لب و لہجے یا فارم کے ساتھ اثر انداز ہوئی۔ اس کی مثال امیر خسرو کے یہاں ملتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان فارسی شاعری کی ترقی میں ایران سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ مغل دربار میں بہت سے شعراء نے شہرت حاصل کی جو فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو ایرانی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خالص ہندوستانی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں فیضی اور بیدل جیسے عظیم شعراء ہیں جنھوں نے فارسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ یہ سلسلہ ہندوستان

اقبال تک جاری رہا اور اردو برصغیر کے مسلم شرفا کے شعری اظہار کی زبان بن گئی۔[2]

اردو زبان وادب پر فارسی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "تمام علم نواز گر فارسی داں تھے اس لئے اردو شاعری کو فارسی سے الگ کرکے دیکھنا مناسب نہ ہوگا۔

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس وقت جب شمالی ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی، جنوب میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن میں زیادہ تر شیعہ فرقے کے بادشاہ حکمرانی کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم بیجاپور اور گولکنڈہ کا علاقہ ہے۔ ادبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے فارسی کے ساتھ ساتھ ان درباروں میں اردو کو بھی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس طرح اردو جو فارسی اور شمالی ہند کی بولیوں کا مرکب ہے پہلی مرتبہ جنوب میں ادبی زبان کی شکل حاصل کرتی ہے جو شمال کے مسلم حملہ آوروں کے ذریعے ایک نوآبادیاتی زبان کے روپ میں یہاں پہنچی تھی۔[3]

جنوبی ہند کی یہ زبان جسے دکنی یا
دکھنی کہتے ہیں، زبان کے جدید معیاروں کے تحت
کئی لسانی خدوخال کی حامل ہے اور اس میں لکھا
ہوا ادب ایک عظیم اور نایاب ذخیرے کی اہمیت رکھتا
ہے۔ دکنی کے عظیم شعراء میں سلطان محمد قلی قطب
شاہ کا نام بہت اہم ہے جن کے آسان درباری نغمے
اور گہری جذباتی وابستگی لئے ہوئے مذہبی شاعری
دلوں کو چھو لیتی ہے۔

اردو غزل کی اس روایت نے جو
دکن میں عام ہوئی دہلی کی شاعری پر اپنے اثرات
چھوڑے۔ اس حقیقت کو اگر تہذیبی اور تاریخی
تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی وجہ اورنگ زیب
کا دکن پر حملہ اور دو تہذیبوں کے درمیان باہمی ربط و
ضبط ہے۔ اردو زبان و ادب کی تیزی سے فروغ
پانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب کی
وفات کے بعد ایران اور اسلامی ممالک سے تعلقات
کمزور ہونا بھی اردو کو فارسی کی جگہ دینے میں معاون
ثابت ہوتے ہیں۔ اردو شمال کے مسلم شرفا طبقے

کی شعری زبان بن جاتی ہے۔

ان کے مطابق دلّی میں اردو غزل کی مقبولیت ولی کی آمد سے اور بھی بڑھ جاتی ہے جس میں دکن کی بہت سی روایات کو تسلیم کیا گیا۔ ولی کی طرح بیان کی سادگی اور تازگی جن دوسرے شعراء میں پائی جاتی ہے ان میں سراج دکنی اور ان کے دلّی کے شعراء میں حاتم اور مظہر اہم ہیں۔ لیکن دلّی سیاسی نشیب و فراز کی وجہ سے اردو شاعری کی ترقی کا اہم مرکز نہ بن سکی۔ اسی زمانے میں مسلم شرفا کی تہذیب میں ایک غیر معمولی تبدیلی آتی ہے اور اردو شاعری نوابین اودھ کے دربار میں پہنچتی ہے۔ اس کی وجہ دلّی پر نادر شاہ کے حملے اور طرح طرح کی سیاسی کشمکش ہے جن کی بنا پر بہت سے شعراء نے دربار اودھ میں پناہ لی جن میں سودا اور میر جیسی بزرگ ہستیاں شامل ہیں۔ ان کے بعد اردو شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ انہیں زیادہ تر شعراء ایسے ہیں جن کا گھر تو دلّی میں بستا لیکن ادبی سرپرستی لکھنؤ کے دربار میں

ملی۔ ان میں جرأت، مصحفی اور انشا کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب شاعری میں زبان کے طرح طرح کے تجربے ہو رہے تھے اور خاص طور پر لکھنؤ کے شعراء نے فن شاعری کو صنائع بدائع اور الفاظ کی تراش و خراش تک محدود کر دیا تھا اور شاعری کا عشقیہ انداز ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ناسخ، آتش اس دور کے آخری شاعر ہیں کیونکہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا اودھ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ادب اور آرٹ کے میدان میں اودھ کو جو مرکزی اہمیت حاصل تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔

انگریزوں نے لکھنؤ اور دلی کی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنے کی مصنوعی کوشش تو کی لیکن وہ ادبی جوش و خروش باقی نہ رہا۔ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسی زمانے میں دہلی میں اردو شاعری کا بہترین کلاسیکی ادبی سرمایہ وجود میں آتا ہے جس میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو حاصل ہے۔ اس وقت اردو

ادب کی سرپرستی مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کر رہے تھے۔ ان میں شیفتہ جیسے نفاست پسند ادیب تھے اور اس چھوٹی سی دنیا میں تین عظیم شخصیتیں غالب، مومن اور ذوق کی تھیں جن کے اسلوب نے اردو غزل کو نئے خیالات سے ہم آہنگ کیا۔

ڈلوڈ اور شیکل غالب کو تمام اردو شعراء میں سب سے عظیم تصور کرتے ہیں اور اس دور کو دہلی اسکول کی شاعری کا دوسرا دور مانتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ادب میں بھی ایک زبردست انقلاب نمودار ہوتا ہے۔ اردو ادب کی کلاسیکی روایات کو داغ دہلوی نے ایک نیا مزاج دیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دوران داغ کو مجبوراً دہلی چھوڑنی پڑی اور انھوں نے کچھ دنوں تک نواب رامپور کی سرپرستی میں سکونت اختیار کی اور کچھ عرصے بعد نظام حیدر آباد کے دربار میں مقیم رہے۔ اس طرح اردو کا

کلاسیکی شاعری دکن کی زمین سے شروع ہوئی اور اسی زمین پر اختتام پذیر بھی ہوئی۔ داغ کی شاعرانہ عظمت پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ان کی شاعری میں دلکشی اور حسن اور بامحاورہ زبان ہونے کے باوجود ان کے یہاں قوت بیان کا قحط ہے۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں بادشاہت کے خاتمے کے بعد متوسط مسلم طبقہ ابھر رہا تھا اور ایسی تبدیلی ادب میں بھی ظہور پذیر ہوئی۔ حالی جیسے ادیب جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اسی زمانے کی دین ہیں۔ حالی کی شہرت شاعری کے معیار خصوصاً غزل کے فنی شعری قواعد و ضوابط اور ان کے مسدس کی وجہ سے ہوئی لیکن غزل میں ان کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح یہ دور غزل کے زوال کا دور کہا جا سکتا ہے جس میں اقبال جیسے شاعر غزل کے نہیں بلکہ نظم کے میدان میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن غزل کا یہ زوال پذیر انداز حسرت کی شاعری میں

نئے زاویے پیش کرتا ہے اور غزل میں مختلف
سیاسی خیالات کے راستے کھول کر اس کا کینوس
اور بھی وسیع کیا۔
غزل کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے
ان علماء کی مراد یہ نہیں کہ غزل کی سماجی اور
ادبی حیثیت ہی نہیں رہ گئی بلکہ نئے سیاسی
اور سماجی حالات میں غزل کو نئے موضوعات اپنے
دامن میں سمیٹنے چاہئے جس سے غزل کی معنویت
میں اضافہ ہو اور غزل کی سماجی حیثیت بنی
رہے۔

اس طرح اگر اردو ادب کا تاریخی
جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ غزل ایک
عرصۂ دراز تک درباروں اور شرفا کی تفریح طبع
کا سامان بنی رہی۔ باطنی طور پر غزل نے بہت
سے روایتی اور پہلے سے طے شدہ عناصر کو شریک
بھی کیا لیکن شاعری میں استاد اور شاگرد کی
روایت برقرار رہی جس کے ذریعے کوئی نیا شاعر
کسی استاد کی شاگردی اختیار کرکے ہی اس کی

شہرت اور عظمت کے سہارے خود کو نمایاں
اور مقبول کر سکتا ہے۔

# حوالے

۱ D. J. Matthews and C. Shackle:
An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics

"Although its history in Urdu is relatively short the Ghazal is, by European standards, a poetic form of great age." Page: 2

۲ Ibid

"--- while later under the Mughals India became a more important centre than Iran itself for the cultivation of Persian poetry. At the Mughal ~~contr~~ court there flourished a large number of distinguished poets, writing Ghazal

in Persian including Persian poets drawn from Iran by Mughal patronage and others born in India. Among the latter the greatest were Faizi (d. 1595) and Bedil (d. 1721), the last great poet of India to use Persian as a living, natural means of expression. Thereafter, although significant Persian poetry continued to be written in India untill the time of Iqbal (d. 1938) Urdu became the prime medium of poetic expression for the Muslim elite of the sub-continent."

Page: 3

۱۳ Ibid

"--- there thus arose the paradoxical situation that Urdu, in origin an amalgam of Persian and northern Indian dialects, was first cultivated as a literary language in South India where it had been brought as a colonial language by Muslim invaders from the north."

Page: 3

مستشرقین سے ہندوستان اور بالخصوص
اردو کا رابطہ سترھویں صدی سے شروع ہوا۔ یہ بیان
کیا جا چکا ہے کہ یہ رابطہ دوہری نوعیت کا تھا۔
ایک طرف مستشرقین تھے جو ہندوستان کی قدیم
تاریخ اور تہذیب کو اپنی علمی یا عملی ضرورتوں کی
بناء پر سمجھنا چاہتے تھے اور کسی ملک اور اس کی
تہذیب کے بارے میں واقفیت، وہاں کی زبانوں
اور وہاں کے ادبیات کے ذریعے ہی حاصل کی جا
سکتی ہے۔ اسی لئے انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں
اور ان زبانوں کی ادبیات کو سیکھنے کی کوشش کی۔
اس دور میں اردو نہ صرف عملاً سرکاری
زبان تھی بلکہ ہندوستان کے ~~[illegible]~~ تقریباً ہر علاقے میں
سمجھی جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔
سرکاری زبان ہونے کی بناء پر انتظامیہ کی اصطلاحیں
عدالتوں کی اصطلاحات اور دفاتر میں کام آنے والے الفاظ
اسی زبان کے رائج تھے۔ اس بناء پر انگریز

اور یورپی مستشرقین کا اردو کی طرف متوجہ ہونا بڑی
حد تک لازمی تھا۔

دوسرے وہ مستشرقین تھے جو یورپ
کے نشاۃ ثانیہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے غلط یا
صحیح یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے تہذیبی طور پر
پسماندہ علاقے کو یورپ کی فکر و نظر سے فیض
پہنچانا ان کا تاریخی فرض ہے۔ یعنی وہ ہندوستانی زبانو
اور ان کے ادب کو یورپ کی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا
چاہتے تھے اور یہاں کے ادب کی تاریخ اور تفہیم یورپی
نظر اور مغربی پیمانوں سے کرنا چاہتے تھے۔

ان کے سامنے بہت بڑی دشواری یہ تھی
کہ ان کا سابقہ جس ملک، جس زبان اور جس ادب سے
ہوتا وہ ان کے اپنے ملک اپنی زبان اور اپنے ادب
سے بالکل مختلف تھا۔ اس لئے جگہ جگہ پر یورپی نظر
اور مغربی پیمانوں کے برتنے سے یہاں کے ادب کی جو
تصویر ابھری یا جو نمونے سامنے آئے وہ یہاں کی
روایات سے پوری طرح انصاف نہیں کر سکے۔ اس
میں کچھ مستشرقین کی دیانتدارانہ مجبوریوں کو بھی دخل

تھا اور بعض صورتوں میں شعوری توجیہات کی ۔

—

مستشرقین کے سب سے پہلے تاریخ کا جو شعور قائم کیا وہ بڑی حد تک ان کے محدود نقطۂ نظر کا پابند تھا ۔ انھوں نے ہندوستان کی پوری تاریخ کو دو مذہبی وحدتوں میں بانٹنے کی کوشش کی ۔ پہلا دور ہندو تاریخ کا اور دوسرا مسلم تاریخ کا ـــ اس گمراہ کن تقسیم کے اثرات میں بجا طور پر بعد کے مورخین نے توجہ دلائی ہے ۔ ڈاکٹر رومیلا تھاپر لکھتی ہیں : لے

"What is perhaps the most significant aspect of Mill's History of British India was that in sense it laid the foundation for a communal interpretation of Indian history and thus provided the historical justification for the two nation theory. He was the

first historian to develop the thesis of dividing Indian history into three periods which he called Hindu civilisation, Muslim Civilisation and British civilisation (interestingly enough, not Christian civilisation"

اس فرضی اور گمراہ کن تاریخی تصور کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان کے کلچر کو مختلف علاقوں کے جغرافیائی، اقتصادی اور تہذیبی عوامل کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کے بجائے مذہب کو تہذیب کی مرکزی قدر کی حیثیت دے دی گئی گویا ۱۲۰۶ء سے قبل کے ہندو حکمرانوں کے زیرِ نگیں ہندوستان کے ادب اور تہذیب کو ہندو مذہب کی دین قرار دے کر اس کے مخصوص کردار اور مزاج کی نشاندہی کی جانے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں تھا بلکہ اس دور میں مختلف غیر ہندو تہذیبیں بھی ابھری تھیں اور مختلف علاقائی ادبیات میں ان تہذیبوں کی گونج صاف سنائی دیتی

تھی ۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ غیر ہندو تہذیبوں
اور غیر مغلوں کی ادبیات مناسب اہمیت سے محروم کر
دی گئیں ۔

اس طرح ہندوستان کی تاریخ کا دوسرا
دور مسلم ہندوستان کہا گیا اور اس دور میں اسلام کو مرکزی
حیثیت دے کر تہذیب اور ادب کا رشتہ مذہب سے جوڑ
دیا گیا ۔ بار بار اس کا ذکر کرنا کہ مسلمان ہندوستان میں آئے
یا مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے زبان اور ادبیات کا
سلسلہ شروع ہوا اس بات کو ذہن نشین کرانے کے
لئے تھا کہ مسلمان خواہ کسی بھی ملک سے کیوں نہ آئے
ہوں یا خواہ ان کا تعلق کسی بھی زبان یا ادبی روایت
سے کیوں نہ ہو وہ سب کے سب مسلمان اور غیر ہندوستانی
ہونے کی بناء پر یکساں تھے ۔ ان کا کوئی رشتہ ہندوستان
کی روایات اور تہذیبی فضا سے نہ تھا چنانچہ گریرسن
لکھتے ہیں : ۲۵

"--- Urdu employed chiefly by
Musalmans and by Hindus who
have adopted the Musalman

system of education, and a modern development, called Hindi, employed only by Hindus who have been educated on a Hindu system. Urdu, itself has two varieties, the standard literary form Delhi and Lucknow, and the Dakhini, spoken, and used as a literary medium, by Musalmans of Southern India."

پروفیسر انا ماری شمل نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر پوری مسلم ادبیات کی صف میں اردو زبان و ادب کو شامل کر کے اس کی اجتماعی خصوصیات سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے گویا اردو بھی، کوئی ایسی اسلامی زبان ہے جس کی ادبیات کا رشتہ زمین اور علاقے نہیں، مذہب سے ہے۔ "Three Mughal Poets" کے دیباچے میں وہ لکھتی ہیں: ۳ک

"Like the Turkish, Urdu poetry

has inherited from Persian the highly developed play on words, which can add inimitable charm by the clever use of the Arabic, Persian, and Indian elements of the poetical languages each of which bears not only its simple meaning but also different accessory notions. From this stems the peculiar art of oscillation between mystical and profane meanings, or between sensuality and spirituality, which is so typical of classical Islamic poetry."

اس پوری بحث سے ایک اور غلط فہمی پیدا ہوئی اور وہ غلط فہمی یہ تھی کہ اردو زبان شاید کوئی ایسی زبان تھی جو مسلمان حکمرانوں کے حکم سے ہندوستان کے رہنے والوں پر اسی طرح ٹھونسی گئی جس طرح انگریزوں کے دور میں انگریزی۔ حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ ہندوستان میں اول تو جو مسلمان فاتح یا حکمران کی حیثیت سے داخل ہوئے وہ سب کے سب کسی ایک ملک کے رہنے اور کسی ایک تہذیب کے ماننے والے نہ تھے۔ کوئی ترک تھا تو کوئی افغان، کوئی مغل تھا ایرانی اور جو لوگ جس علاقے کے رہنے والے تھے ان علاقوں کی تہذیبوں اور ادبی روایات کی پرچھائیاں ان کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مستشرقین نے عام طور پر اور برطانوی مستشرقین نے خاص طور پر ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مشترک آریائی ماضی کو نظر انداز کر دیا اور مذہب کی دیوار پر زیادہ زور دیا جو ان دونوں کے مشترکہ ماضی کو یکسر مٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ماضی کی اس طویل

نسلی وراثت کے تسلسل کی طرف پہلی بار محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں اشارہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ۔۔ کہ

" اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ برسوں سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انھیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثری تصنیف نہیں وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ متھرا میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ

یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی
اب ہندوستان کی زبان کو اپنی زبان
سمجھنے لگے تھے۔"

اور زیادہ تفصیل و شرح و بسط کے
ساتھ پروفیسر محمد حسن نے اٹھارویں صدی میں اردو شاعری
کا فکری اور تہذیبی پس منظر میں ذکر کیا ہے۔ وہ
لکھتے ہیں:- ۴۵

"یہ ادبی اور لسانی انقلاب کیوں ہوا اور
اس کے تاریخی اور تہذیبی اسباب کیا
تھے؟ عام طور پر ادبی انقلاب ذہنی
اور جذباتی انقلاب کا عکس ہوتے
ہیں۔ ادبی انقلاب نئے تقاضوں
کی بنا پر ہوتے ہیں اور ان تقاضوں
کی گونج بیک وقت سیاست سے
لے کر تہذیب و معاشرت تک سبھی
شعبوں میں سنائی دیتی ہے۔
سیاست میں تبدیلیاں اقتصادی
نتائج میں شکست و ریخت سے

ہوا کرتی ہیں۔ جب تک کوئی مخصوص
نظام ذریعۂ پیداوار کی راہ میں
رکاوٹ نہیں بنتا اور انھیں آگے
بڑھاتا رہتا ہے اس وقت تک
وہ تاریخی ضرورت کو پورا کرتا
ہے۔ جب وہ ذرائع پیداوار کی
راہ میں رکاوٹ بن جائے اور
اس نظام کی وجہ سے سماج کا
بڑا حصہ زندگی کی عام ضروریات
سے محروم ہو جائے تو تبدیلی ناگزیر
ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایسے طبقے
وجود میں آنے لگتے ہیں جو سماج
و نظام حکومت ہی سے نہیں بلکہ
نظام اقدار سے بھی مطالبے کرتے ہیں
اور زندگی کو ایک نئے سانچے میں
ڈھالنا چاہتے ہیں"

آگے لکھتے ہیں: ؎

"۔۔۔ ایسے سرداروں کا طاقت

پکڑنا جو ایرانی النسل نہیں تھے
اور جن کی ساری قوت کا ان کے
ہندوستانی علاقوں، قبیلوں اور ان
علاقوں کے سپاہیوں پر دار و مدار
تھا۔ تہذیبی اور ادبی زندگی میں
بھی تبدیلی کا پیش خیمہ تھا۔
یہ ایرانیت کے دلدادہ ضرور تھے
مگر یہ اور ان کے حواری اور
متوسلین تہذیب اور ادبی مذاق
کی جس سطح پر تھے اس کے پیش
نظر انھیں ہندوستانی زبان و
ادب میں فارسی کی چاشنی کی
تلاش تھی۔ وہ مشاعروں اور
قوالیوں میں فارسی غزلوں پر
سر تو دھن لیتے تھے مگر ان کی
روحیں اس طرز کی شاعری کو
اپنی زبان سننے کے متمنی تھیں۔
فارسی سرکاری زبان تھی۔

خواص نے اب بھی وہ ذریعہ اظہار
بنی ہوئی تھی لیکن عوام کی ایک نئی
سطح کے سیاسی اور سماجی اہمیت
اختیار کر لینے کی بنا پر فارسی کے
بجائے زیادہ عام فہم زیادہ
بے ساختہ اور زیادہ عوامی ذریعۂ
اظہار کی ضرورت محسوس کی جانے
لگی تھی —

——— ریختہ نے ایک طرف ادب
اور بول چال کی زبان کی خلیج
پاٹ دی اور دوسری طرف عوام اور
خواص کی باہمی خلیج کو پر کر دیا —
فارسی کبھی بھی عام بول چال کی زبان
نہیں بنی — وہ چند محلوں اور گھرانوں
کی زبان تھی — ایک حیثیت سے
اس کی نوعیت وہی تھی جو آخری
دور میں سنسکرت کی ہو گئی تھی —
فارسی امرا اور خواص کی زبان تھی

اور ادب اور اثاث کے لئے مخصوص تھی
جبکہ اردو کوڑی بولی کا ایک مخصوص
روپ۔ عوام کی بول چال کی زبان بن
گئی تھی۔ ریختہ نے پہلی بار شہری
عوام کے جذبۂ اظہار کو زبان دی۔
ادبی زبان اور بول چال کی زبان کا
فرق مٹایا اور جو کام دیہات میں بولیاں
کر رہی تھیں اور ہندی شاعری کے ذریعہ
سرانجام پا رہا تھا اسے شہر کے پیمانے
پر زیادہ ہمہ گیری اور لطافت کے
ساتھ ریختہ نے پورا کیا۔"
ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب "قومی تہذیب
کا مسئلہ" میں اردو زبان کی ابتداء اور ارتقا کا ذکر کرتے
ہوئے لکھا ہے: کہ
"۔۔۔ اجنبیت اور مخالفت کی جو خلیج
سلطنت دہلی کے ابتدائی عہد میں
حائل تھی اسے بہت سی چیزوں
نے مل کر جن مسلمان صوفیوں اور

"ہندو مسلمانوں کی یکجائی نے بڑی رواداری اور محبت کی روح پھونکی تھی۔ غیریت دور کر دیا تھا اور دونوں قوموں کے خیالات و جذبات خصوصاً ان کے مبالغہ شعور میں تاثیر و تاثر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا --- مشترک تہذیب کی جڑ ہمیشہ ایک مشترک زبان ہوتی ہے اس لیے کہ جب تک انسانوں کی کسی جماعت کے پاس تبادلۂ خیالات کا کوئی مشترک وسیلہ نہ موجود ہو ان میں اتحاد خیال اور اتفاق مذاق کا پیدا ہونا ناممکن ہے ---

مسلمانوں نے ہندوستان آنے کے بعد دہلی کے علاقے میں مقامی بولی اور فارسی کے میل جول سے ایک مشترک کاروباری زبان بن گئی جو آگے چل کر اردو کہلائی ---"

اس سے اندازہ ہوگا کہ زبانوں کی ابتدا کی جو تصویر برطانوی مستشرقین اور مورخین پیش کی اس کے دو نہایت گمراہ کن مضمرات تھے:

(الف) ۔

یہ کہ ہندوستانی میں جو تہذیبی عمل مسلمانوں کے ہندوستان فتح کر لینے سے پیدا ہوا وہ بنیادی طور پر تہذیبی اختلاط اور میل جول کا عمل نہ تھا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کا ہندوستان کے رہنے والوں پر نافذ کرنے کا عمل تھا جس میں جبر اور ضرورت شامل تھی ۔

(ب) ۔

اردو زبان و ادب کا تعلق بنیادی طور پر مسلم حکومت اور مسلمان حکمرانوں سے تھا ۔

ظاہر یہ دونوں باتیں غلط تھیں اول تو مسلمانوں کا کوئی مذہبی تعلق اردو کے آغاز کا سبب نہیں بنا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو مسلمان گروہ ہندوستان آئے خواہ وہ صوفیہ کی حیثیت سے آئے

ہوں خواہ فاتح کی حیثیت سے وہ مختلف علاقوں کی زبانیں بولتے ہوئے آئے تھے اور ہندوستان آنے اور یہاں رہنے بسنے کے بعد یہاں کی بولیوں اور علاقائی زبانوں سے اثر قبول کر کے اپنی مادری زبانوں کو ترک کر کے یا ان کے پہلو بہ پہلو یہاں کی دیسی زبان کے اثرات سے ایک ملواں زبان کی بنیاد پڑی اس لئے اردو کے بدیسی پہلو کے بجائے اس کے دیسی پہلو پر زور دینا زیادہ مناسب اور ضروری تھا جو مستشرقین نے نظر انداز کر دیا۔

دوسرے اردو زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت کبھی بھی مسلمان بادشاہوں کی توجہ سے نہیں ہوئی۔ دکن کے بعض شکوک اور مشتبہ روایات سے قطع نظر انیسویں صدی سے پہلے اردو کبھی بھی سرکاری زبان نہیں رہی۔ شاہ عالم ثانی کے دربار میں پہلی بار اس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی اور اس دور میں یا اس سے قبل جب کبھی بادشاہوں امیروں اور وزیروں نے اس کی سرپرستی کی تو دراصل اس زبان اور

اس نے ادب کی عوامی مقبولیت کی وجہ سے ہوئی گویا دربار میں اسے جو اہمیت حاصل ہوئی وہ اس کی اپنی قوت اور ہردل عزیزی کی بنا پر تھی۔

---

ان دونوں مفروضات کے تباہ کن اثرات اردو زبان و ادب ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان و ادب اور تاریخ کے لئے بڑے دور رس ثابت ہوئے۔ زبان کو مذہب کے ساتھ منسلک کر کے پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کو برطانوی مستشرقین نے تین اصطلاحوں سے بانٹ دیا:

الف - ہندوستانی

ب - اردو

ج - ہندی

ان کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ ہندوستانی وہ زبان ٹھہری جس میں بول چال کے عام الفاظ استعمال ہوں اور جس کی عام سطح کاروباری انداز سے اوپر نہ اٹھے۔ اردو وہ زبان جو مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی اور اس میں

فارسی و عربی کے الفاظ کے استعمال کو اس کی خصوصیت
قرار دیا گیا اور ہندی ہندوستانی کی وہ شکل قرار پائی جس
میں فارسی و عربی کے الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ
اور اصطلاحیں استعمال ہوں چنانچہ گریرسن لکھتا ہے۔

"When Hindustani is highly Persianised, and takes the form of Urdu, the words are often so foreign in sound that they cannot be conveniently represented in the Devanagari character. Hence Urdu is always written in Persian character. Similarly highly Sanskritised Hindi does not lend itself to the Persian character and always appears in Deva-nagari. Amongst fanatics who ought to know better, but do not wish to do

so, this question of character has unfortunately become a sort of religious shibboleth. True Hindustani can be written with ease in either character, and Musalmans find it easiest to read it in the Persian and most Hindus in the Deva-nagari. But, owing to the fact that the extreme varieties of Hindustani on each side can only each be written in one character, these fanatics have confused alphabet with language."

اس تنازعے کے بارے میں
"Sahibs and Munshis" کا مصنف لکھتا ہے: [59]

"However, a distinction must be made between Kharibolí

and Urdu. Urdu was a Persianised style of Khariboli which developed into a sophisticated literary dialect. But Khariboli as such was not a literary language and it was identical with Hindustani. At least that was the situation when the College of Fort William came to existence. Otherwise the question of Hindustani being in its formative stage as a literary language would not have raised at all."

اسی طرح پنڈت رام چندر شکل
اپنی مشہور کتاب हिन्दी साहित्य का इतिहास
میں لکھتے ہیں کہ کھڑی بولی عام طور پر مسلمانوں
کی زبان سمجھی جاتی تھی : ۵۱

"देश के भिन्न-भिन्न भागों में मुसलमानों के फैलने तथा दिल्ली की दरबारी शिष्टता के प्रचार के साथ ही दिल्ली की खड़ीबोली शिष्ट समुदाय के परस्पर व्यवहार की भाषा हो चली थी। खुसरो ने विक्रम की चौदहवीं शताब्दी में ही ब्रजभाषा के साथ-साथ ख़ालिस खड़ीबोली में कुछ पद्य और पहेलियाँ बनाई थीं। औरंगज़ेब के समय से फ़ारसी मिश्रित खड़ीबोली या रेख़्ता में शायरी भी शुरू हो गई और उसका प्रचार फ़ारसी पढ़े लिखे लोगों में बराबर बढ़ता गया। इस प्रकार खड़ीबोली को लेकर उर्दू साहित्य खड़ा हुआ जिसमें आगे चलकर विदेशी भाषा के शब्दों का मेल भी बराबर बढ़ता गया और जिसका आदर्श भी विदेशी होता गया।"

اس طرح برطانوی مستشرقین نے
کھڑی بولی یا ہندوستانی کو اپنے قلم کی ایک جنبش سے دو الگ
الگ زبانوں میں تقسیم کرایا اور ان کے درمیان مخاصمت
اور مقابلے کی ایک دیوار قائم کر دی گئی - اس کے پہلو بہ پہلو
ان کے لئے دو الگ الگ رسم خط کی تلاش بھی شروع ہوئی -
اور یہ رسم خط ایک دوسرے کے مخالف بنا کر پیش کئے گئے ،
ہندی دیوناگری کو "Lingua franca for the Hindus"
قرار دینے کی کوشش ہونے لگی اور اس طرح جدید ہندوستان
کے تن پر ایک ایسا زبردست لسانی قضیہ شروع ہوا جو
۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند و پاک کے بعد بھی ختم ہونے میں نہیں
آیا ہے -

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پوری
دنیا کی تاریخ میں یہ ایک انوکھی مثال ہے جب دو زبانیں
ایک ہی نحوی ڈھانچے سے ابھری ہوں اور دو الگ الگ
رسم خط میں لکھی جاتی ہوں اور محض چند ایسے الفاظ اور
اصطلاحوں کی وجہ سے جداگانہ بلکہ ایک دوسرے کی حریف
سمجھی جائیں جو وہ بعض قدیم یا غیر ملکی زبانوں سے
مستعار لیتی ہوں - زبانوں کی پہچان الفاظ اور اصطلاحیں

نہیں ہوتے بلکہ ان کی نحوی بنیادیں ایک ہوتی ہیں۔ مگر ان دونوں
زبانوں کے بارے میں یہ عام اصول بھی فراموش کر دیا گیا
ہے اور ان کے درمیان نفرت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔
اس کی سب سے دلچسپ مثال بھارتیندو
ہرش چندر کے زمانے میں کھڑی بولی کے اسلوب کے سلسلے
میں راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند اور راجہ لکچھمن پرشاد کی بحث
سے ملتی ہے۔ پنڈت رام چندر شکل کے الفاظ میں: [11]

"सरकार की कृपा से खड़ीबोली की अरबी-फारसी-
मय रूप लिखने पढ़ने की अदालती भाषा होकर
सबके सामने आ गया। जीविका और
मान मर्यादा की दृष्टि से उर्दू सीखना
आवश्यक हो गया। देश भाषा के नाम पर
लड़कों को उर्दू सिखाई जाने लगी। हिंदी
की काव्य परम्परा यद्यपि राजदरबारों के
आश्रय से चली थी पर उसके पढ़ने
वालों की संख्या भी घटती जा रही
थी। --- इस स्थिति का वर्णन करते
करते हुए स्वर्गीय बाबू बालमुकुन्द गुप्त

लिखते हैं :

जो लोग नागरी अक्षर सीखते थे, फ़ारसी
अक्षर सीखने पर विवश हुए और हिन्दी
भाषा हिन्दी न रहकर उर्दू बन गई —
हिन्दी उस भाषा का नाम रहा जो टूटी
फूटी चाल पर देवनागरी अक्षरों में
लिखी जाती थी।"

یعنی وہ تمام تحریریں جن میں عربی فارسی الفاظ نکال دئے جائیں تو ایک دوسری زبان کی تحریریں کہلائیں اس کا ایک مضحکہ خیز حد تک عجیب پہلو یہ تھا کہ مشہور اردو شاعر انشاء اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" کو محض اس وجہ سے ہندی کا پہلا ناول کہا جانے لگا کہ اس میں مصنف نے جان بوجھ کر عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کیا ہے یا بہت کم کئے ہیں حالانکہ کہ شاعر انشا کا ہندی ادب کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں ہے —

—

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ اردو کے خلاف یہ تعصب پھیلایا گیا کہ مسلمان حکمرانوں کی مانند

کی ہوتی زبان ہے اور اس کا ادب زوال ادب ہے یا اس کا تعلق درباروں سے ہے۔ برطانوی مستشرقین نے اس رویے کو پھیلانے میں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر خاصہ اہم حصہ لیا۔ چنانچہ یہ خیال کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں فارسی اور اس کے بعد اردو کو رائج کیا اور اس ادب کو ہر شعبے میں پھیلانے کی ذمہ داری مسلمان حکمرانوں کی ہے۔ جا بجا مستشرقین کے لکھے ہوئے تاریخ ادب کے مضامین میں جھلکتی ہے۔ مثلاً رالف رسل اپنی کتاب کا نام مغل پوئٹس (Mughal Poets) رکھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میر اور سودا دونوں میں سے کوئی بھی مغل دربار سے متعلق نہ تھا اور دونوں منتقل ہو کر دہلی سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہاں بھی باقاعدہ دربار سے منسلک نہ تھے۔ تیسرے شاعر میر حسن کی نوعیت ان دونوں سے زیادہ آزادانہ تھی اور وہ مغل دربار سے کسی حیثیت بھی وابستہ نہ تھے بلکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ فیض آباد میں گزرا اور اودھ میں مغل دربار نہ تھا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ تمام ادبی اصناف جو درباروں کے باہر نشو و نما پاتی رہیں اور

ایسے شاعر اور ادیب جو ان دائروں سے الگ تھلگ رہے،
تاریخ ادب میں یا تو سرے سے جگہ ہی نہ پا سکے یا پھر مناسب
اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ ان میں شاید سب سے اہم نام
نظیر اکبر آبادی کا ہے اور ایسے لاتعداد شاعروں کے نام
ہیں جو گمنام رہے مگر ان کی فکر و فن سے عوامی ادب
کی پرورش ہوئی اور اردو کے ادبی سرچشمے سرسبز ہوئے۔
عوامی سطح پر میل جول اور تہذیبی اختلاط کے اس عمل کو
اور اس عمل کے تاریخی تسلسل کو مستشرقین نے
نظر انداز کر دیا۔

چنانچہ اردو ادب شرفا کے ایک ایسے ادب
کی طرح پیش کیا گیا جس کی جڑیں زمین میں نہ تھیں اور
جس کی علاقائی وفاداریاں مشتبہ تھیں۔ اس بنا پر اردو
کے عوامی رشتوں کو سرے سے اہمیت نہیں دی گئی جس
کی بنا پر بعد کو آنے والے ہندوستانی مورخین کی نظر سے
بھی یہ پہلو بڑی حد تک اوجھل رہا۔

---

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادبی تاریخ
کا باقاعدہ تصور پہلی بار اردو میں انگریزی مستشرقین

کی کوششوں سے آیا اس سے قبل تذکروں کی روایت عام تھی اور تذکروں کی تقسیم، تدوین عام طور پر یا تو اب، ت کے حساب سے کی جاتی تھی یا پھر اب ج د ہ وغیرہ کے اعتبار سے۔ اور عام طور پر ان کا کارنامہ مختلف شاعروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب اور ان شاعروں کے بارے میں سکہ بند اور حاصے مبالغہ آمیز الفاظ میں اظہار خیال تک محدود رہتا تھا۔ ان میں البتہ ایسے تذکرے بھی شروع ہی سے تھے جن میں ادوار سے تعین کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ تعین تین ادوار کی شکل میں کیا گیا

دور متقدمین

دور متوسطین

دور متاخرین

ظاہر ہے کہ یہ ادوار مختلف تذکروں کے لکھے جانے کے وقت مختلف ہوتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی تقسیم کسی نہ کسی حد تک ضرور تاریخی کہی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان مختلف

ادوار کے لکھنے والوں کی مشترک ادبی خصوصیات کی نشان دہی کی جا سکے مثلاً متقدمین کو ایہام گوئی کا دور کہا گیا لیکن اس قسم کی کوشش کم ہے اور ان کا دائرہ کار محدود ہے۔ مستشرقین کی تصانیف اور ان کے زیر اثر لکھی جانے والی کتابوں میں البتہ تاریخ کا زیادہ بہتر شعور ملتا ہے۔

اس کے باوجود برطانوی اور مغربی مستشرقین کی اس مجبوری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اردو ادب کی اصناف کی روح اور ان کے روایتی ماخذ کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے۔ یہ کوتاہی بڑی حد تک ان کے مختلف انداز نظر اور مختلف معیاروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مثلاً اردو ادب میں مغربی اثرات کے عمل دخل سے پہلے ایسی متعدد اصناف موجود تھیں جنھیں کسی مغربی صنف کے معیار پر جانچنے پرکھنے کے بعد اس کی ناقص شکل قرار دیا گیا اور اسی بنا پر اس کی تراش خراش ضروری سمجھی گئی مثلاً قصے اور داستانیں ناول کا ناقص ادب قرار دی گئیں اور غالباً اسی بنا پر برطانوی اور مغربی مستشرقین کی لکھی ہوئی تاریخ ادب قصے اور داستانوں کے ذکر سے

خالی ہیں یا ان کا ذکر بہت کم اور بہت ناقص طریقے پر کیا گیا ہے۔ مثلاً گراہم بیلی کے یہاں بھی ضمنی طور پر اردو نثر کا ذکر ملتا ہے جس میں مختلف نثر نگاروں سرسری ذکر کیا گیا ہے اور نثر کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس میں فکر، معتبر اور صحت مند تاریخ اور اچھی تنقید کا فقدان ہے:[۲۲]

"In prose we miss philosophy, impartial history and penetrating criticism. There are works on historical subjects, but generally speaking they show a lack of genuin research and unprejudiced investigation. Criticism tends to confine itself to questions of verbal cleverness and linguistic correctness."

اس طرح تحریری اعتبار سے بیلی کی تاریخ ادب اردو، اردو ادب کی تاریخ نہ رہ کر اردو کے شعری سرمائے کی تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔

اسی طرح غزل کو مغربی lyrics کے

پیمانے میں ڈھالا گیا اور غزل کے خلاف اکثر فیصلے جو

بعد میں صادر کئے گئے دراصل مستشرقین کے غزل کو مغربی

معیاروں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی بنا پر ہوئے

غزل کے ضمن میں یہ بات دلچسپی

سے خالی نہ ہوگی کہ غزل میں عشق و عاشقی کے تذکرے

اور معاملات حسن و عشق اس کی علامتوں اور رمزیات کو

جوں کا توں لغوی معنوں میں سمجھنے کی غلطی دورِ حاضر

تک کے برطانوی مستشرقین نے کی ہے مثلاً رالف رسل

غزل میں مذکر فعل کے استعمال سے دھوکا کھاتے ہیں اور

امرد پرستی کے سلسلے میں ایک طویل نوٹ لکھنا ضروری خیال کرتے

ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں مذکر فعل کا استعمال

لازمی طور پر امرد پرستی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ مسعود حسن رضوی ادیب

نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ: [۱۳]

" اردو شاعری کا جو حصہ اعتراض کی

آنکھوں میں کھٹکتا ہے وہ ہے جو عشق محبت سے تعلق رکھتا ہے۔

جذبات عشق میں ایشیا اور یورپ میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔

جن لوگوں نے صرف انگریزی شاعروں کی بنائی ہوئی محبت کی

تصویریں دیکھی ہیں وہ ہمارے مصوروں
کے کمال کی داد کیا دے سکتے ہیں ؟
عشقیہ شاعری کا تعلق جہاں تک ہے
انگریزی اور اردو شاعری میں جسم و
جان کا فرق ہے ۔ انگریزی شاعروں
نے اگر پیکر محبت کے مجسمے بنائے ہیں
تو ہمارے شاعروں نے روح محبت کی
تصویریں کھینچ دی ہیں ۔

”۔ ۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں معشوق
جنس ذکور سے ہوتا ہے اور امرد پرستی
کے جذبات نظم کئے جاتے ہیں ۔ اس
لئے وہ خلاف فطرت بھی ہے اور مخرب
اخلاق بھی ۔ اگر یہ اعتراض کرنے
والے ذرا آنکھ کھول کر اردو شاعری کے
وسیع میدان کی سیر کریں تو حقیقت
خود بول اٹھے گی کہ اس اعتراض کی
بنا وہم یا ناواقفیت پر ہے ۔ اردو غزل
میں ہزارہا شعر ایسے ملتے ہیں جن میں

معشوق کی نسوانیت نے پردہ لگا رکھا ہے۔"

وہ آگے لکھتے ہیں: ۱۴؎

"اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا
ہے کہ جب معشوق جنسِ اناث
سے ہوتا ہے تو مردانہ لباس میں
کیوں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی
ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب
عورتوں کا ذکر کرنا اور نام لینا تک
شرم و حیا کے خلاف سمجھتی ہے۔
ان کے حسن و جمال کا کھلم کھلا بیان
کرنا اور ان سے علانیہ عشق و
محبت کا اظہار کرنا تو اتنا بڑا گناہ
ہے کہ رشتے ناتے ٹوٹ جاتے ہیں"۔

اسی طرح ڈیوڈ میتھیوز اور شکل اپنی کتاب
An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics
میں عشق کی ان تہہ در تہہ معنویت کو نہیں سمجھ پائے جو
اردو غزل کو نئی جامعیت اور تہہ داری دیتی ہے اور اسے
بلیغ اشاروں کا ایک حیرت انگیز مرقع بنا دیتی ہے۔

یہی حال مثنوی کا ہے جسے مسلسل
نظم کا بدل نہیں سمجھا گیا اور اس کی مخصوص بحر اور بعض
دوسرے التزامات کی بنا پر اسے نظم مسلسل کا درجہ
نہ ملا۔

غرض برطانوی مستشرقین کے
ماخذ نے اردو ادب کی ان بنیادی اقدار پر غور نہیں
کیا جو اسے مشرق کے مزاج سخن سے ملی ہیں۔ اردو
ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی اس لئے اس پر
مشرقی مزاج کی گہری چھاپ ہونا قدرتی بات ہے۔

مشرقی مزاج لازمی طور پر کسی قدر
تہہ داری، رمزیت اور اختصار کو پسند کرتا ہے۔ وہ مسلسل
بیان کا متحمل نہیں ہو پاتا بلکہ اشاروں اشاروں میں تہہ
در تہہ معنویت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی آگاہیاں عرفان
کائنات کی نئی نئی مہم نہیں ہوتی بلکہ مانوس سچائیوں کا ایک
ذخیرہ ہوتی ہیں جو نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہتی ہیں اس
لئے مشرق کے نزدیک آگاہی، انفرادی دریافت نہیں جتنی
اجتماعی آہنگ ہے اور اس آہنگ کے رموز و علائم افسانہ
داستاں سبھی متعین تھے ہیں اور ان مسلمہ مشترک سانچے

میں رد کر دیں متنوع جذبات و احساسات ظاہر ہوتے
رہتے ہیں۔ سرکاری اور مغربی مستشرقین علامتوں کے
اس تہہ در تہہ اور بلیغ مرقعوں تک پہنچنے میں کامیاب
نہیں ہو سکے اور اردو کے اصناف سخن پر ان کے تنقیدی
محاکمے یا تو خوش اخلاقی اور مروت کے باعث ہیں یا پھر
ان کے اپنے ذوق سلیم کی کمی پر دلالت کرتے ہیں۔
اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اردو
ادب کو سرکاری مستشرقین نے مشرقی روایات کا
حصہ اور ہندوستانی مزاج کا آئینہ دار سمجھ کر پیش کرنے کی
کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کا رشتہ یا تو مذہب سے
ملا دیا یا پھر اسے بعض حکمرانوں کے زیر اثر پیدا ہونے
والے ایک درآمد کئے ہوئے تمدن یا ادب سے ملا دیا جس
کی وجہ وہ اردو ادب کے مشرقی تشخص کو نہیں سمجھ
سکے اس بنا پر ان کے یہاں تنقیدی درجہ بندی کی کمی
بھی جابجا جھلکتی ہے۔

---

بہرحال اگر سرکاری مستشرقین کے
کارناموں اور کمزوریوں کا میزانیہ تیار کیا جائے تو ان کی

ادبی خدمات کا یقیناً اعتراف کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ
ساتھ ان کی پیدا کردہ ان غلط فہمیوں کی بھی نشاندہی کرنی
ہوگی جن کی بنا پر آگے چل کر تہذیبی اور ادبی گمراہیاں
پھیلیں۔

جہاں تک خدمات کا تعلق ہے
اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی مستشرقین نے
پہلی بار بکھرے ہوئے ادبی یادداشتوں اور بیاضوں کو
مربوط ادبی تاریخ کا تسلسل بخشا اور اسے تاریخی شعور
اور تسلسل کے ساتھ تاریخ ادب کی شکل میں مرتب کیا۔
تذکروں سے تاریخ ادب تک لانے کا سہرا یقیناً برطانوی
مستشرقین کے سر ہے۔

اس عمل کے دوران انھوں نے صرف
شاعری ہی کو ادب نہیں سمجھا بلکہ تمام قدیم تر ادبی تذکروں
کے برخلاف نثر کو بھی اہمیت دی اور نثر و نظم دونوں
کو ملا کر ایک مکمل ادبی تصویر تیار کرنے کی کوشش
کی۔ یہ صحیح ہے کہ نثر کا ذکر کم رہا اور اس کو وہ
اہمیت کبھی نہیں حاصل ہو سکی جس کی وہ مستحق
تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ برطانوی مستشرقین

اس تحقیق کے نہ عادی تھے نہ اس کے وسائل رکھتے
تھے جو نثر کے ابتدائی نمونوں کو ڈھونڈ نکالتے اور
ان کا مربوط اور معروضی تنقیدی مطالعہ کرنے کے لئے
ضروری تھیں ۔ ان کا مقصد تو محض عام قاری کے
لئے ایک رواں اور دلچسپ تاریخی بیان فراہم کرنا تھا
جس سے اسے اردو ادب کے عام رجحان کا اندازہ
ہو جائے لیکن اس کے باوجود نثر کو اہم ادبی صنف
کی حیثیت سے تاریخ ادب میں جگہ دینے کے سلسلے میں
ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً
بیلی نے تاریخ لکھتے وقت تذکروں کو بنیاد بنایا جن کے غیر
معتبر ہونے کا اس نے خود بھی اعتراف کیا: [۱۵]

"Information about the early Urdu poets is ultimately derived from old Persian anthologies, the great majority of which are unpublished. --- There is considerable doubt about dates particularly the earlier ones. The anthologies frequently

omit dates, and often differ in the dates they give."

اسی طرح رسل کی تصانیف ہیں جن کا مقصد غیر اردو دان طبقے کو اردو سے روشناس کرانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "لے

"It is an attempt which so far as we know has not been made before, to introduce to the English-speaking reader the work of three great poets of one of the major modern languages of the Indian sub-continent namely Urdu."

تیسری اہم خدمت انھوں نے یہ انجام دی کہ اردو ادب کو ایک غیر ملکی کی معروضی نظر سے دیکھا۔ ظاہر ہے ان کا معیار مختلف تھا اور وہ مغرب کے ادبی ذوق کے پروردہ تھے لیکن ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس قسم کے مقالات میں ناگزیر

ہیں انہوں نے کسی نہ کسی حد تک اردو ادب کی تاریخ کو عالمی معیاروں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہمارے ادب کو وہ شناخت تو فراہم نہ کر سکے جو اس کا حق تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی کوششوں سے اردو ادب کو خود اپنی تصویر دیکھنے کو ملی اس کے ساتھ ایک وسیع تر حلقے میں متعارف ہونے کا موقع ملا۔

مگر ان خدمات کے باوجود

برطانوی مستشرقین کے افکار و اعمال بنیادی طور پر ان کے تصور تاریخ سے متعین ہوئے تھے اور اس تصور تاریخ میں ان کے سیاسی منصب اور موقف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لئے مختلف ادوار میں ان کی علمی نقطۂ نظر پر بھی ان سیاسی مصلحتوں کا سایہ صاف نظر آتا ہے۔ گریرسن نے یقیناً ہندوستان کی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ مرتب کر کے ایک تاریخ ساز خدمت انجام دی مگر یہ جائزہ بھی اس قسم کی مصلحتوں اور کمزوریوں سے یکسر خالی نہیں ہے۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو بھی اردو داں یا ہندی داں

نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مگر یہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا
کہ اردو ہندی نزاع کو موجودہ شکل دینے کی بڑی ذمہ داری
فورٹ ولیم ہی کے سر ہے یا کم سے کم اس نزاع کا نقطۂ
آغاز فورٹ ولیم ہی نے فراہم کیا۔

ان سب کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا
کہ مستشرقین کی تاریخ نویسی دراصل Acculturation
اور استفادہ اور مختلف مزاج تہذیبوں کے نقطۂ نظر کی
آمیزش کی دلچسپ اور معنی خیز مثال فراہم کرتی ہے اور
تقابلی ادب کے مطالعے کا ایک اہم موضوع ہے۔ ڈیوڈ
کاف کے الفاظ میں: ؎

"The representatives of the British nation in India who were largely responsible for these positive aspects of Westernisation and Modernisation were a group of "acculturated" civil, military, and judicial officials (and some missionaries) who we

identified as Orientalists. --- In 1954, at the Social Science Research Council Summer Seminar on Acculturation, the process was broadly defined as culture change that is initiated by the conjunction of two or more autonomous culture system."

اردو ادب اور تاریخ ادب نے ان کوششوں اور کاوشوں سے بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا۔ مگر اس کے باوجود برطانوی اور مغربی مستشرقین کی کوششیں اپنے کارناموں اور کمزوریوں کے باوجود اردو ادب کے مطالعے اور اس کی تاریخ نویسی کے طریقۂ کار کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔

# حوالے


۱۔ Romila Thapar:

"Communalism and the writing of Indian History" Page: 4

(People's Publishing House, New Delhi - 1981)

۲۔ G. A. Grierson:

"Linguistic Survey of India, Vol. IX, Pt. I"

Page: 1

(Motilal Banarsidass, Delhi. )

۳۔ Annemarie Schimmel:

"Three Mughal Poets" Page: IX

(George Allen and Unwin, Ltd. London, 1969)

۴۔ محمد حسین آزاد

"آب حیات" : صفحہ ۳۰

(رام نرائن بینی مادھو پبلشر و بک سیلر الٰہ آباد ۱۹۶۳ء)

۴ پروفیسر محمد حسن:

"دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر" صفحہ: ۱۸

(۱۷۰۷ء سے ۱۸۱۵ء تک)

ادارۂ تصنیف - علیگڑھ - ۱۹۶۴ء

۵ ایضاً صفحہ - ۴۸

۶ ڈاکٹر عابد حسین

"قومی تہذیب کا مسئلہ" صفحہ - ۱۳۱

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ - ۱۹۵۵ء

۷ G. A. Grierson:

Linguistic Survey of India - Vol. IX Pt. I

Page: 49

8 Sisir Kumar Das

"Sahibs and Munshis" Page-45

(Orion Publications Pvt. Ltd., N. Delhi - 1978)

9 राम चन्द्र शुक्ल

हिन्दी साहित्य का इतिहास - पृष्ठ: 279

10 Ibid Page: 294

नागरी प्रचारिणी सभा काशी - सं. 2025 वि.

۱۲ے T. Grahame Bailey

"A History of Urdu Literature" Page-102

(Sunil Publications, Delhi – 1979)

۱۳ے مسعود حسن رضوی ادیب

"ہماری شاعری" صفحہ: ۱۰۴–۱۰۵

(کتاب گھر، لکھنؤ — ۱۹۵۴ء)

۱۴ے ایضاً صفحہ-۱۰۹

۱۵ے T. Grahame Bailey

A History of Urdu Literature Page-1

۱۶ے Ralph Russel

Three Mughal Poets Page - XV

۱۷ے David Kopf

British Orientalism and Bengal Renaissance

Page – 4

( Firma K. L. Mukhopadhyay - Calcutta - 1969)

# کتابیات

## انگریزی:

1. Arberry, A.J., British Orientalists
William Collins - London - 1943

2. Arberry, A.J., Asiatic Jones
British Council Publications, London - 1944

3. Bailey, T.G., A History of Urdu Literature
Sumit Publications, Delhi - 1979

4. Brelvi, Ebadat, Poems of John Gilchrist
University Oriental College, Lahore - 1977

5. Chatterjee, Atul and Burn, Richard
British Contribution to Indian Studies
Longmans Green and Co., London - 1943

6. Carr, E.H., What is History
Penguin Books - 1976

7. Das, Sisir Kumar, Sahibs and Munshis
Orion Publications, Pvt. Ltd., New Delhi - 1978

8. Ghoshal, A.K., Civil Services in India
(Under East India Company)
Calcutta University, 1944

9. Garratt, G.T., Legacy of India
Oxford University Press - 1967

10. Grierson, G.A., Linguistic Survey of India
Motilal Banarsidass, Delhi-

11. Holborn, Hajo, History and Humanities
Doubleday and Company, New York, 1972

12. Kopf, David, British Orientalism and
Bengal Renaissance
Firma K.L. Mukhopadhyay, Calcutta, 1969

13. Kidwai, S.R., Gilchrist and the
'Language of Hindustan'
Rachna Prakashan, New Delhi - 1972

14. Latif, S.A., The Influence of English Literature on Urdu Literature
Forster Groom and Co. Ltd., London - 1924

15. Meinecke, F., Historicism
Routledge and Kegan Paul, London - 1972

16. Pearson, J.D., Oriental and Asian Bibliography
Crosby Lockwood & Son Ltd., London - 1966

17. Russell, Ralph, Three Mughal Poets
George Allen & Unwin, London - 1969

18. Russell, Ralph, Ghalib - Life and Letters
George Allen & Unwin, London - 1969

19. Russell, Ralph, Ghalib: the Poet and His Age
George Allen & Unwin, London - 1972.

20. Strauss, Claude Lev, Structural Anthropology
Basic Books Publishers, London - 1963

21. Said, Edward W., Orientalism
Routledge and Kegan Paul Ltd.
London - 1978

22. Siddiqi, M. Atique, Origins of Modern Hindustani Literature
Naya Kitab Ghar – Aligarh – 1963
23. Thapar, Romila, Communalism and the Writing of Indian History
Peoples' Publishing House, Delhi – 1981
24. Wellek, René and Warren Austin
Theory of Literature
Penguin Books, 1976
25. Wellek, René, Discriminations
Vikas Publications, Delhi – 1970

Books consulted in India Office Library, London:

1. Arberry, A.J., Oriental Essay: Portraits of Seven Scholars, London, 1960
2. Alger, W.R., The Poetry of the East - London - 1856
3. Baillie, A.F., The Oriental Club and Hanover Square - London-1901
4. Boyd, A., Guide to Fourteen Asiatic languages London - 1947
5. Boardman, E.P., Asian Studies in Liberal Education - Washington-1959
6 - Chatterji, S.K., and Chaudhari, S. International Congress of Orientalists 26th Congress, New Delhi - 1964 - Vol. I
7. Ceadel, E.B., Literatures of the East: An Appreciation - London - 1953

8. De Bary, W.T. and Embree, A.T.
A Guide to Oriental Classics – New York, 1964

9. Dandekar, R.N. and Raghavan, V.
Oriental Studies in India – New Delhi 1964

10. De Bary, W.T., and Embree, A.T.
Approaches to Asian Civilisation, New York – 1964

11. De Bary, W.T., Approaches to Oriental Classics
New York – 1959

12. Forrest, D., The Oriental; Life Story of a
West End Club. London – 1968

13. Gafurov, Speech at International Congr-
ess of Orientalists in New Delhi – 1964

14. Gibb, H.A.R., Area Studies Reconsidered
London – 1963

15. Ghosal, U.N., Progress of Greater Indian
Research Calcutta – 1943

K. Gilchrist, J.B., Hindoostanee and English Dictionary - Calcutta - 1786-90

17. Gilchrist, J.B., Grammar of Hindoostanee language - Calcutta - 1796

18. Gilchrist, J.B., Oriental Linguist Calcutta - 1798

19. Gilchrist, J.B., Appendix (to Grammar and Dictionary) Calcutta - 1798

20. Gilchrist, J.B., Hindoostanee Philology Edinburgh - 1810

21. Gilchrist, J.B., A New Theory of Persian Verbs Calcutta - 1801

22. Gilchrist, J.B., Oriental Fabulist Calcutta - 1803

23. Grierson, G.A., Modern Vernacular Literature of Hindustan Calcutta - 1817

24. Hunter, W.W., A Comparative Dictionary of the Languages of India and High Asia London - 1868

25. Hadley, Capt. George, Grammatical Remarks on the Practical and Vulgar Dialect of Indostan London - 1772

26. Hosking, R.F. and Meredith-Owens, G.M. A Handbook of Asian Scripts London - 1966

27. Jarrett, H.S., A manual of reference to the examinations in Oriental languages held throughout the Bengal Presidency Calcutta - 1875

28. James, H.R., Education and Statesmanship in India London - 1911

29. Kabir, Humayun, International Congress of Orientalists, New Delhi - 1964 Vol. II

30. Keay, F.E., A History of Hindi Literature
London - 1933

31. Lehmann, Fritz, Urdu Literature and Mughal Decline - Michigan - 1970

32. Lang, D.M., A Guide to Eastern Literatures
London - 1971

33. Morris, H., Literation and Transliteration: Suggestions and notes, London - 1901

34. Martin, R.M., Wellesley's Minutes and Dispatches_3 Vols. London - 1836

35. MaxMullar, F., Sacred books of the East (in 50 Vols.) Oxford - 1879 - 1910

36. Max-Mullar, F., Bibliographical Essays
London - 1884

37. Mahmood, Syed, A History of Education in India - 1781 - 1893 - Aligarh - 1895

38. Prusek, Jaroslav, Dictionary of Oriental literatures London - 1974

39. Philips, C.H., Handbook of Oriental History London - 1951

40. Pearce, R.R., Memories and Correspondence of Richard Marquess Wellesley - London 184[illegible]

41. Roy, D., Grammar, Calcutta - 1854

42. Ross, E.D., Eastern Art and Literature London - 1928

43. Ranking, Lieut. Col. G. S. A., History of the College of Fort William, Calcutta.

44. Roebuck, Thomas, Annals of the College of Fort William - Calcutta - 1819

45. Shah, Ikbal Ali Sirdar, The Oriental Carvan London - 1933

46. Singh, Puran, The Spirit of Oriental Poetry Punjab - 1969

47. Satthianadhan, S., History of Education in Madras Presidency, Madras – 1894

48. Trevelyan, C.E., On the Education of the People of India, London – 1838

49. Thomas, F.W., Presidential Address at All India Oriental Conference, 1937 – Trivandrum.

50. Tietjens, Eunice, Poetry of the Orient London – 1928

51. Wellesley, Richard Marquis, The Annals of the College of Fort-William – Calcutta – 1819

52. Wheeler, S., The Annals of the Oriental Club 1842 – 1858 London – 1925

53. Woodrow, H., Macaulay's Minutes on Education in India London – 1862

54. Yates, W., Transliteration London – 1858

55. Yule and Burnell, Hobson Jobson (a glossary of colloquial Anglo Indian words and phrases). London - 1903

## RECORDS & REPORTS:

1. Bureau of Education, India
Selections from Educational Records, Part I (1781 - 1839)
Edited By H. Sharp
Published at Calcutta by the Superintendent, Govt. Printing, India - 1920

2. Selections from Educational Records, Part II (1840 - 1859)
Edited by J. A. Richey
Published at Calcutta by the Superintendent Govt. Printing, India - 1922

3. Selections from Educational Records of the Govt of India – Development of University Education (1860 - 1887)
Edited by J. P. Naik
Published for the National Archives of India by the Manager of Publications, Govt. of India
Delhi – 1963.

4. Proceedings, Home, Public, 1799
(India Office Library, London)

5. Public Dispatches, Home, Public, 1830
(National Archives of India, Delhi)

6. Proceedings, Home, Public, 1834
(India Office Library, London)

7. Macaulay Minute
(India Office Library, London)

8. Resolution, Home, Public, 7th March, 1835
(India Office Library, London)

9. Proceedings of the College of Fort William, Home, Miscellaneous. (India Office Library, London)

10. U.G.C. Committee Report, London - 1961

11. Report of the Conference of Directors of Public Instruction, Delhi - 1917 (India Office Library, London)

12. Public Disputation of the Students of the College of Fort William in Bengal, Calcutta - 1811 (India Office Library, London)

13. Asiatic Annual Register, London - 1805 (India Office Library, London)

14. Kirpatrick's Letter to the Court of Directors (Home, Public, Aug., 1785) India Office Library, London.

15. Proceedings, Home, Public, Jan., 1800 (India Office Library, London)

## Periodicals:

1. The Asiatic Annual Register, London (1801 – 1807)
(India Office Library, London)

2. The Asiatic Researches, Calcutta (1788 – 1800)
(India Office Library, London)

3. The Bengal Past and Present
(India Office Library, London)

4. The Calcutta Gazette (India Office Library)

5. Quarterly Review, London – 1817
(India Office Library, London)

## اردو :


۱. آزاد، محمد حسین - آب حیات
رام نرائن بینی مادھو، پبلشرز و بک سیلرز الٰہ آباد سنہ ۱۹۶۷ء

۲. ادیب، مسعود حسن رضوی - ہماری شاعری
مطبع نول کشور، لکھنؤ، سنہ ۱۹۴۸ء

۳. بیمز، جان - ہندستانی لسانیات کا خاکہ
(ترجمہ و مقدمہ از پروفیسر احتشام حسین)
دانش محل، لکھنؤ، سنہ ۱۹۷۱ء

۴. حسن، محمد - دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور
فکری پس منظر (سنہ ۱۷۰۷ء سے سنہ ۱۸۱۵ء تک)
ادارہ تصنیف - علی گڑھ سنہ ۱۹۶۴ء

۵. حسین، سید عابد - قومی تہذیب کا مسئلہ
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سنہ ۱۹۵۵ء

۶. حسین، آغا افتخار، یورپ میں تحقیقی مطالعے
مجلس ترقی ادب، لاہور، سنہ ۱۹۶۷ء۔

۷. حسین، آغا افتخار، یورپ میں اردو
مرکزی اردو بورڈ، لاہور، سنہ ۱۹۶۸ء۔

۸- حسینی، میر بہادر علی - اردو رسالہ - کلکتہ سنہ ۱۸۲۰

۹- صدیقی، محمد عتیق - گلکرسٹ اور اس کا عہد
انجمن ترقی اردو ہند - نئی دہلی - سنہ ۱۹۷۹ء

۱۰- قدوائی، صدیق الرحمٰن - ماسٹر رام چندر
شعبۂ اردو - دہلی یونیورسٹی - سنہ ۱۹۶۱ء

۱۱- یوسف علی، عبداللہ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے
تمدن کی تاریخ کراچی - سنہ ۱۹۶۷ء

हिन्दी:

1. पाण्डेय, मैनेजर, साहित्य और इतिहास दृष्टि
पीपुल्स लिटरेसी, दिल्ली, 1981.

2. वार्ष्णेय, लक्ष्मी सागर, फोर्ट विलियम कालेज
१८०० – १८५४ ई.
हिन्दुस्तानी, एकेडमी, इलाहाबाद, सं. 2008.

3. वार्ष्णेय, लक्ष्मी सागर, (अनुवादक)
गार्सां द तासी का हिन्दुई साहित्य का इतिहास
हिन्दुस्तानी एकेडमी, इलाहाबाद, १९५३

पत्रिका:

आलोचना, त्रैमासिक, अंक ३६, ३७, ३८
(१९६६ ई.)
सम्पादक: नामवर सिंह
राजकमल प्रकाशन प्राइवेट लिमिटेड, दिल्ली।

Writings of Orientalists preserved in India-Office Library, London (Hindustani Books)

1 Alexander, C.W.W. and Mukund Lala:
ZUBDAT AL-HISAB (The Element of Arithmatic),

Lahore 1868, 1869, 1870-71, 1875, 1877, 1878, and 1879.

2 Anderson, R.P.
GUL-I-BAKAWALI (Trans. in English),

Delhi 1851.

3 Barrow, C.M.
FOURTH READER (Anglo-Hindustani, 3rd edition),

Madras 1883

4 Battenburgh, C.A.
RIFAH-i-Khalaiq - A Treatise directed against Prodigality in Marriage Expenses and other Social Customs.

Allahabad 1874.

5 Beal, J.B. or J.W.
BIJLI KI DAK: THE ELECTRIC TELEGRAPH.

Agra.1854.

6 Beal, J.W. (1) MIFTAH AL ULUM - Lessons in Natural Philosophy Translated from the English.

Sialkot.

(2) MUFID-AL-ULUM Translated from English.

Agra 1853.

7 Bensley, Joseph (Fana),
DIWAN-E-FANA

Meerut 1876.

8 Capt Thomas Jenkins,
GURU SIMPLE OR SHAIKH CHALLI KA QISSAH-translated by
Capt T Jenkins from Tamil work by C.J. Boschi,

Madras 1843.

9 Bocker, L.C., MUGRBZI ILM BAJA KA

Amritsar, 1893.

10 Boley, W., Rev, (1) ISAI MUSAFIR, Allahabad 1845.

(2) MUSAFIR KA BARHNA, Ludhiana 1840.

11 Bradshaw, J.,
FIFTH READER, Madras 1888.

12 Breton, Peter,
HADDIYAON KA BAYAN: OSTEOLOGY,

Agra 1869.

13 (1) Briggs, W., Rev.
AFSARAN-E-PARMAT: THE CUSTOM HOUSE OFFICERS, Ludhiana, 1873.

(2) EK TAMSIL OUR USKI TAWIL, Allahabad, 1872.

(3) Narah-i-ilan, Lahore, 1868.

(4) QADR-DANI, Allahabad 1872, Ludhiana 1872-73.

(5) Taswiyah i adlo raham, Ludhiana, 1877.

14 Brodhead, A., Rev.
(1) BURJ-I-MUSTAHKAM, Allahabad 1873, Ludhiana, 1875.

(2) DINI AUR DUNYAWI TARIKH, Allhabad 1874.

(3) TARIKH-I-KALISIYA, Allahabad 1877.

(4) TUHFATAL ULMA, Amritsar, 1876.

15 Burke, Edmund, GRAIN AND FODDER CROPS, Lahore, 1892.

16 Burn, R.S.
ILM-I-FALAHAT, Aligrah 1866, Amritsar 1875.

17 Butler, J.H.
AMAL JARRAHI KE, Delhi 1848.

18 Buyors, W., Rev,
YAHUDIYON KA AHWAL (3rd Edn.), Agra 1854.

19 Caleb, J.J. Rev. (1) INTIKHAB-I-TARIKHI-KALISIYA, Allahabad,1871.
(2) RASTABZ AUR SHARIR KA ANJAM,
Allahabad 1872.

20 Carnegi, P.
QAHANIN - I - KALAKTARI, Agra, 1861.

21 Clarke, R., Rev(1)OGIT, Amritsar 1875.
(2) KHAZANAT AL ASRAR, LUDHIANA 1875-76.
(3) MIFTAH AL TAURIT, Ludhiana 1876.
(4) RAHI NAJAT, Ludhiana 1875.

22 Collier, W.F.,
WAGA-I-NIGARI INGLISTAN, Lucknow, 1873.

23 Colvin, A,
KARANAMAH-I-KALVIN, Lucknow 1892.

24 Conard, Rev. Father,
CONFUTATION OF OBJECTIONS, Benaras, 1877.

25 Cooke, C.R.,
Tahrir i Uqlidis, Lahore 1972-73, 1875, 1876, 1877, 1878 and 1879.

26 Corbet, A.F.,
Ilami-Falahat, Allahabad, 1868

27 Corcoran, J.,
Tarikh-i-Mamalik-i-Chin, vol.1, Calcutta, 1848.

28 Conelius, A.J.,
Khulasai-hidayat i Avadh Polis, Lucknow, 1877.

29 Court, H.M.,
(1) Araish-i-Mahfil, Allahabad, 1871, Calcutta 1882.

(2) Selections literally translated into English, Simla 1872.

(3) Nasre-Benazir, Simla, 1871.

30 Cox. E.T. Capt,
Regimental Moonshi, London 1847.

31 Craven, T.Rev.,
Git ki kitab, Lucknow, 1877.

32 Crooke, W.,
Enthnographical and Folklore Catechism, Mirzapur, 1872.

33 Crossman, H., Rev.
Usul al din al Isavi, Agra, 1873.

34 Currie, F.,
Majmuahi imtehan-i-qawanin, Lucknow 1876.

35 Dacosta, L.,
Lubbal Tawarikh, Calcutta 1829-30.

36 Dallas, A.H.,
Panjab Jail Mannual translated by J.Goldney, Peshawar 1867.

37 Cust, R.N.,
Dastur al amal i patwariyan, Lahore, 1874.

38 Davies, R.H.,
Makhzan al Tijarat, Lucknow, 1871.

39 Davis, B.,
Git, Allahabad 1874.

40 Droese, E., Rev.,
Int aur Pore, Agra 1873.

41 Estwick, E.B.,
(1) Bagho Bahar, Hertford 1852.

(2) Khirad Afroz, Hertford 1857, Madras 1879.

42 Edmonstone, G.F.,
Majmuat al Jinayat, Agra, 1850.

43 Elgin, Lord,
Tarikh-i-Chin-o-Japan translated by Fredrick Gundy, Lucknow 1867.

44 Elliot, Lieutenant,
Qavaidi Swaran, Poona, 1877.

45 Erhardt, J., Rev.,
Talim al mutadi, Agra 1873.

46 Fagan, G.S.,
Procedure of the Civil Court of the East India Company, Calcutta 1852-53.

47 Fallon, F.,
Tarik-i-Shuara i Urdu, Delhi 1948.

48 Fanthome, F.,
Taid-i-Mazhab-i-Roman Katholik, Agra, 1894.

49 Fasken, E.T. Lieut.,
Questions and Answers on Drill, Madras, 1861.

50 Fieldbrave, Isaac, Rev.

(1) Qaid Kusha, Lucknow, 1874.

(2) Yuhanna-i-Faqih Ke Mukashafat, Lucknow 1873.
Amritsar 1878.

51 Fink, C.C.,

(1) Ilmi-hikmat, Calcutta 1843.

(2) Talim al nafas, Agra 1853.

52 Fitzpatrick, T.H. Rev,
Tafasil al Kalam (Scripture Text Book)
Lahore 1874.

53 Flavel, J. Rev.,
Chasma-i-Zindagi (The life and teaching of Christ),
Allahabad 1848.

54 Forbes, Duncan,

(1) Bagho Bahar, London 1848.

(2) Tota Kahani, London 1852.

55 Forman, C.W. Rev.

(1) Ajib hikayat, Ludhiana, 1874.

(2) Bayani Fraqlit, Ludhiana 1875.

(3) Iliya Ka Qissah, Ludhiana, 1869-75.

(4) Iltimas, Ludhiana, 1873.

(5) Larkon Ka git mala (Hymns for Children),
Ludhiana 1875.
Lahore 1872.

(6) Masih Ki paidaish, Ludhiana 1869.

(7) Qissai mar-i-biranji, Ludhiana, 1873

(8) Qissai Qarzdar, Ludhiana 1869-77.

(9) Qissai Patras, Ludhiana, 1869

(10) Rahi Salamat, Ludhiana, 1873.

(11) Risalah i tahrif, Ludhiana, 1876.

(12) Saharcah dar Inglistan, Ludhiana, 1868, 1870.

(13) Shukuke-i-Kaffara, Ludhiana 1973.

(14) Sual o Jawab, Ludhiana, 1867.

(15) Tansil i Lagar, Ludhiana, 1877.

(16) Tariq-i-Tahqiq, Ludhiana 1877.

(17) Tegho Sipare-i-Iswai, Ludhiana, 1875.

(18) Tuhfata al Muslihim, Ludhiana 1860-75.

(19) Ummed o Jannat, Ludhiana 1868-69.

(20) Wafat-i-Masih, Ludhiana 1867, 1870, 1875.

(21) Zikri Istifan, Ludhiana, 1867, 1870, 1875.

56 Forstyth, Sir, T.D. (1) Qanun-i-Shahadat, Lahore 1871.

(2) Safar Namah, Lahore 1871.

57 Fox, W.C.E.,
Ilmal Amraz, Rohtak 1878, Lahore 1879.

58 Francis, C.M.,
Pardah Sistam, Jalander, 1895.

59 French T.V., Bishop,
Injil-i-Daud, Ludhiana 1877.

60 Fulford, C.R,
Regulations for out post duty, Agra 1872.

61 Gallagher, P.F., Regulations for Conducting the
Musketry Instruction of Army, Bombay, 1869.

62 Garcin de Tassy, J.H.

(1) Allegories recits poetiques, II Edn, Paris 1876.

(2) Baghe Bahar (translated into French), Paris 1978.

(3) Gul i Bakawali (translated into French), Paris 1858.

(4) Qissa i Kamrup o Kala, Paris 1835.

63 Gilberne, Charles,
Purane aur Nai Ahad nama ki injil, Ludhiana, 1889.

64 Gilchrist, J.B.

(1) Hindee Manual, Calcutta 1802.

(2) Hindi Story Teller, Calcutta, 1802.

(3) The Oriental Fabulist, Calcutta, 1803.

(4) The Urdu Risalah or Qawaid-i-Zaban-i-Urdu,

Agra 1845, Calcutta 1820, 1831, 1846, 1847, 1875; Madras 1852, 1860, 1873

65 Gilchrist, R.A. Cavalry Regulations of Hyderabad
Contingent, Madras 1873.

66 Glen, W. Rev.,
Din-i-haqq ki bari baton ka Majmuah, Mirzapur,
1850.

67 Goldney, J. Pajab Jail Manual, Peshawar, 1867.

68 Gowan, B.E. Capt. Out post Duty, Lahore 1872
1872
1872
1877

69 Graham, G.F., Irving,
Annexation of Panjab, Gazipur, 1863.

70 Griflin, G.
Catechectical Explanation of Field Excercises,
Calcutta 1847

71 Haim, David, Shahajan Shahpari aur Roshan-Jahal,
Bombay 1876.

72 Halket, W.G.C., Capt.
Musketry Regulations, Lahore 1877.

73 Hari, John,
(1) Masahi Musafir Ka ahwal, Ludhiana 1869,
Lahore 1870.

(2) Sair i talib-al-najat, Allahabad, 1847-50.

74 Hartman, Anastasius,
Naya Ahadnamah, Sardhana 1879.

75 Hewlett, John, Rev.
Agustinas Ke iqrarat, Mirzapur, 1876.

76 Hoernle, T.Rev.
Maqaddas Kitab ka ahwal, Agra 1847
Ludhiana 1869, 1873, 1873
1877

77 Hogg, R.W.
Field Exercises, Calcutta 1837.

78 Hoggon, Major,
Musketry Instruction, Ludhiana, 1873.

79 Holroyd, W.R.M.

(1) How to Speak and Write English (Eng-Urdu Edn),
Lahore 1875.

(2) Jugraphi-Panjab, Lahore 1870.

(3) Scheme for Translitrating Urdu in Roman Characters,
Amritsar 1878.

(4) Tashil-al-Kalam (Hindustani-English Dialogues),
Delhi 1867, Lahore 1876.

80 Hooper, W, Rev.

(1) Asha-i-Rabbani, Lahore 1878.

(2) Begunahi-i-Masih, Amritsar, 1878.

(3) Haqiquat-i-Gunah, Amritsar 1878.

(4) Jahan ka nur, Ludhiana, 1876.

(5) Masih ki Badshahat, Ludhiana 1875.

(6) Namaz ki tartib, Ludhiana 1875.

81 Hoskins, R. Rev. (1) Khalid-al-kitab, Allahabad 1878.

(2) Yuhanna ki Injil ki Tafsir,

Lucknow 1876, Ludhiana 1876.

82 How, W.W. Rev.
Nasahat al Asha, Agra 1872.

83 Humphro, E.J. Rev.
Akhlaqi Kahanian, Lucknow 1875.

84 Himphrey, Mrs. (1) Do Julahon ki guftugu, Allahabad, 1871.

(2) Salib Bardar, Lucknow 1874.

85 Irving, Mrs.
Ghar ka Rasta, Allahabad, 1874.

83 Jacob, Joseph, Rev.

(1) Jughraphia i pak Kitab, Agra 1867.

(2) Khilwati Duaon Ki kitab, Agra 1875.

87 Jonkins, Thomas.

(1) Articles of War (Qawaid Iashkari), Madras 1843.

(2) Shaikh Challi ka Qissah (translated from Tamil work by C.J. Beschi), Madras, 1843.

88 Jeremy, E.L. (1) Git Ka dilchasp Bayan, Agra 1874.

(2) Kaladiya ki haqq Shinasi, Agra 1873.

89 Johns, S.P. (1) Nadim al tubla, Agra 1870-75.

(2) Tashrih al izam, Agra 1869.

90 Johnson, T.S. Rev.

(1) Injil ke Khidmatguzar, Lucknow, 1877.

(2) Tamsili nasihaten, Ludhiana, 1876.

(3) Wadi-al-tubah, Lucknow 1876.

(4) Zamindar ki Tamsil, Ludhiana, 1877.

91 Johnson, W.F. Rev.
Mukhzan-i-Masihi, Allahabad, 1869-78.

92 Johnston, J.W.,
Ilaj al amraz, Ludhiana 1868.

93 Kempson, M., Taubat-al-Nasuh, London 1886, Delhi 1889.

94 King, J.S. Leiut.
Position Drill, Bombay, 1877.

95 Knowles, S. Rev.
Risala-i-miraj, Amritsar 1878.

96 Kristnia, Jamadar,
Catechism on the New System of Drill for Attack Formations for the Native Army, Bombay 1876.

97 Lawrence, Lord, Life of Lord Lawrence by R. Bosworth Smith, Lucknow, 1886.

98 Lazarus, E.J.
Waquiat-i-Rabinsan Kruso, Benaras 1877.

99 Ledlie, J.P., (1) Darogahah ka Dastur al amal, Agra, 1851.

(2) Dastur al ma'ash, Allahabad 1873.

100 Lees, W. Nassau,
Ghuncha-i-Sidq, Calcutta 1854.

101 Letner, G.W.,
Sini-i-Islam, Lahore, 1871-76.

102 Leslie, Miss.
Matla-i-nur, Ludhiana 1875.

103 Leupolt, C.B. Rev.,
Din-i-haqq ki tahqiq, Allahabad 1846.

104 Loyal, C.J.,
Bol Chal, Lahore 1897.

105 Lucas, J.J. Rev.

(1) Alaqab-i-Masihi, Allahabad 1876.

(2) Daktar Judson Sahib, Ludhiana 1877.

(3) Qissah-i-Thuma (The story of Thomas),
Mirzapur 1877.

106 Macleane, W.C.
Treatise on Small Pox, Madras 1857.

107 Mansel, H. Rev. Radd-i-za'o i islam, Lucknow, 1877.

108 Manuel, G.S.,
Rahnuma-i-Dihli, Delhi-1874.

109 Manuel, Joseph,
Diwan-i-Joseph or Guncha i Khatir, Patna, 1868.

110 Manuel, T.,
Ikhwan al Safa, Calcutta 1860.

111 Marden, T. Third Reader (Anglo Hindustani), Madras 1886.

112 Marshall, H.S.
Attack Formation, Moradabad 1877.

113 Martin, G. Rev, Khulasha-i-talim-i-din, Benaras, 1868.

114 Martyn, H., Rev.
New Testament, Serampur, 1814, London, 1819.

115 Mather, Mrs. Lughat-i-Kitab-i-Muqqaddas, Mirzapur, 1875.

116 Mather, R.C.
Din-i-haqq, Mirzapur, 1850.

117 Maxwell, H.H. Miftah al Zafar, Benaras 1852.

118 McMaster, G., Rev. Mumnat-i-qasam-i-laghw, Ludhiana 1874.

119 Meacham, W.M. Capt.
Standing Orders for Bengal Infantry, Benaras 1875, 1878.

120 Medley, J.G.
Bayan Pulon ka, Rurki 1865.

121 Menzines, O.
Dril Manual, Lahore, 1877.

122 Michael, J.
Ikhwan al Safa, London, 1829, Madras, 1840, Bombay, 1844.

123 Miles, F.A. Pinnock's Catechism of Astronomy, Lucknow 1832.

124 Mohan, David, Rev.
Shia al Din, Allahabad 1876.

125 Monier-Williams, Sir, M.
Bagh o Bhar (In Roman Characters)

Bangalore 1872, Benaras 1870, Bombay 1874, 1877.
Cawanpore 1867, 1869, 1875, 1876.
Delhi 1868, 1869, 1871, 1874, 1875, 1876.
Lucknow 1873, 1876. London 1859.
Madras 1876.

126 Moore, J.J.

(1) Acts and Orders for N.W. Provinces 1840-43, Agra 1847.

(2) Majma al Qawanin, Agra 1845-46.

127 Moore, W.J.

(1) Mata ka tika, Beawar 1867.

(2) Mukhtsar yad-dasht-i-haizah, Beawr 1867.

128 Morris, J, English Proverbs with Hindustani,
Cawnpore 1893
Lahore 1896.

129 Morrison, Miss. Safinat al najat, Ludhiana, 1870, 73, 74.

130 Muir, D.
Hidayatnamah i Malguzari, Agra 1848-49, Lahore 1869

131 Mungo, Park.
Safarnamah-i-Mungo Park, Agra 1842.

132 Myers, J.H. Rev.

(1) Gumgashtah Farzand, Ludhiana 1876.

(2) Ziyafat-i-Shadi, Ludhiana 1869.

133 Newton, J. Rev.

(1) Ishtihar, Ludhiana 1874.

(2) Jaisi Karni waisi Bharni, Ludhiana 1874.

(3) Khuda ke aqwal, Ludhiana 1875.

(4) Khulasat al waz, Ludhiana 1875.

(5) Mubarak kau hai, Ludhiana 1875.

(6) Rel ka tikat, Ludhiana 1875.

(7) Sharo fazl, Ludhiana 1875

(8) Tahqiq al Waqiat al Injil, Ludhiana 1875.

(9) Taubah ki zarurat, Ludhiana 1874.

134 Norman, C.B.

(1) Chandmari Sikhane ke qanun, Lahore 1874.

(2) Suider Rifle Exercise, Lahore 1875.

135 Owen, J. Rev.
Tarjumah-i-Mazamir, Allahabad. 1868.

136 Parker, E.W. Rev,
Mintakhabat-i-git, Moradabad 1872.

137 Parsons, J.
Svara-Sangraha (Roman Characters), Benaras 1875.

138 Pavie, Theodore,
Tarikh i Asham, Paris 1846.

139 Perkins, Rev. Bhar-i-Hikmat, Lucknow 1847.

140 Perkins, H.E., Rev.

(1) Burhe Ka Ghar, Ludhiana 1874.

(2) Isa ki Sirat, Ludhiana 1876.

(3) Jesika ki Pahli Dua, Lahore 1874.

(4) Khanagi dua'en, Ludhiana 1870.

141 Perkins, P.H.
Muntakhabat-i-Urdu, Lahore 1868.

142 Pesch, J. (Shor),
Diwani Shor, Meerut 1872-78.

143 Pezzoni, A., Rev.
Hindustani Talim, Calcutta 1873.

144 Pfander, C.G., Dr.

(1) Hall al iskal, Lucknow, 1874.

(2) Tarikh al hayat, Lucknow 1874.

145 Pincott, Frederic A
Alaf Lailah, London 1882, Cawanpore 1884.
Delhi 1890.

146 Platts, J.T.
Ikhwan al Safa, Calcutta 1860, London 1869.

147 Reid, H.S. Tarikh-i-alam, Allahabad 1855, Lahore 1868.

148 Rose, H.A.
Rules for the Guidance of Panchayats, Ludhiana 1895.

149 Rosen, Friedrich,
Indrasabha des Amanat, Leipzig 1892.

150 Rudolph, A. Rev.

(1) Baiza farosh ka ahwal, Ludhiana, 1867, 69, 73,77.

(2) Girdab Ludhiana, 1868, 1873.

(3) Madd o jazr Ludhiana 1868, 69, 73.

(4) Numan-i-mabrus, Ludhiana 1868, 69, 77.

(5) Qissah-i-Habshi ghulam, Ludhiana, 1869-77.

(6) Qurbani-i-Ishaq, Ludhiana 1869.

(7) Rahbar-i-haqiqi, Ludhiana, 1873.

(8) Taswir-i-haqiqi, Ludhiana 1869.

151 Sabunjie, J.L. Rev.
An-Nahlah or "The Bee" - An illustrated Eastern and Western fortnightly (English and Hindustani), London 1877.

152 Sandeman, H.
Haize Ka Ilaj, Allahabad 1853.

153 Sandeman, H.D.,
Taiyari-i-Sarak, Allahabad, 1854.

154 Saunders, R.F.,
Mazhar al Ulum (Discoveries of Science) (a monthly magazine), Ghazipur, 1875-78.

155 Scott, J.M.
Risalah i Surveying (Geometrical Surveying), Cawanpore 1874.

156 Scott, P.G. Colonel,
Standing Orders, Benaras 1877.

157 Scott, T.J. Rev.

(1) The Gospels of Mathew and Mark with Commentaries (Tafsir Mati aur Marqus ki Injil ki) Roman Character, Lucknow 1875.

(2) The Gospel of Luke and John with Commentaries (Roman Characters), Allahabad 1871.

(3) Ilm-i-Ilahi-i-aqli (Natural Theology),
Lucknow 1877.

(4) Ilmi Mantiq (The Science of logic)
(English and Urdu)
Lucknow 1873, Amritsar 1875.

(5) Taqdis al Lught (A Dictionary of Bible Names),
(Roman Character), Lucknow 1873.

(6) Taqdis al kitab, Luknow 1874.

158 Sell, E., Rev.

(1) Chamamstan-i-agib, Madras 1873, 74, 76, 78.

(2) Haqaiq al maujudat (Natural Philosophy),
Madras 1873, Bangalore 1874
1875
1877

(3) Namil al Qawanin, Madras 1877-87.

(4) Jugharafiah, Madras 1875-77.

(5) Khulasat al Qawanin (An Elementary Grammar),
Madras 1874, 78, 79.

(6) Kitab i Sah's (Ancedotes for Children),
Madras 1874, 76, 77.

(7) Muntakhabat-i-Urdu, pts.i, II and VI, Madras 1870-71

(8) Talim al atfal, Madras 1890.

159 Shakespear, John.
Muntakhbat-i-Hindi (with a verbal translation and
grammatical analysis of some part),
vol.2, London 1817-18 and 1824-25.

160 Sherring, M.A. Rev.

(1) Al kitab ke maqamat at mauf, Mizapur 1860.

(2) Imarat al maruf II ed. Mirzapur 1860.

(3) Lughat-i-kitabi-muqaddas, Mirzapur 1875.

(4) Mirat al herkat Mirzapur 1861.

(5) Mufarrih al qulub, Mirzapur 1866.

(6) Muntakhab al ilm, Mirzapur 1860.

(7) Shurat al Mazab al Masih, Mirzapur 1862.

(8) Tazkirat al aqilin (II ed.), Mirzapur 1861.

161 Shurman, J.A. Tarikh Mutaqaddimin o Muto a'khkhi rin ki,
Calcutta 1852
Allahabad 1851

162 Sibthorpe, L.H.

(1) Catechism on attack formation, Bombay 1876.

(2) Catechism on Musketry Instruction, Bombay 1875-79.

163 Small, George,
Tota Kahani, London 1875.

164 Smith, L.F.
Bagh o Bahar (Translation with notes), Calcutta 1813-42, Lucknow 1870 and Allahabad 1896.

165 Smith, R.H.
Decisions of the Suddar Dewani N.W. Provinces for 1850-1851, Agra 1852.

166 Smith, W. Rev.

(1) Dini haqq ki tahqiq, Allahabad 1846, Ludhiana 1891.

(2) Tariq al hidayat, Mirzapur 1850.

167 Smyth, W.C., Lata'if i Hindi (with the Shula i Ishq of Mir Mohammad Taqi) London 1840.

168 Solomon, Edwin,
Hadiqat al Susan Amritsar 1876.

169 Spilsbury, G.G. London Pharmacopoeia, Calcutta 1843-45.

170 Stool, Mrs.
Urdu ki Tisri kitab, Lahore 1879-80.

171 Stern, Rev.

(1) Chand Mufid hikayaton, Mirzapur 1872.

(2) Sual o jawab, Benaras 1868.

(3) Kaifiyat namah i bani Israil Allahabad 1867.

172 Stewart, Rev.
Masihi Kalisiya ki Tawarikh, Sialkot 1892.

173 Stillwell, Capt.
Rifle Exercise, Calcutta 1876-77, Lahore 1877.

174 Stockman, A., Rev. Catechism of Christian Religion Calcutta 1873.

175 Sutherland, Major,
Tarikh i Badshahon i Inglistan, Agra 1855.

176 Thide, Miss.
Bhajan aur git, (without title page) Ludhiana 1875-76.

177 Thomas, D.W. Rev.
Tafsir i kitab i Paidaish, Lucknow 1877, Delhi 1888.

178 Thomas, J., Rev.

(1) Dabistan i marifat, Lucknow 1877.

(2) Guldastah i akhlaq, Lucknow 1875.

(3) Misbahah al Balaghat, Lucknow 1875.

179 Trant, W.H.
Khulasha i Fihristnuma, Calcutta 1820.

180 Tucker, C., Miss,

(1) Amanat i besh qimat, Ludhiana 1877.

(2) Bachchon ki Shadi, Ludhiana, 1878.

(3) Banaras ke do Jatri, Ludhiana 1878.

(4) But ki Khani, Ludhiana 1877, Amritsar 1878.

(5) Chamakdar Roshni, Amritsar 1878-79, Ludhiana 1877.

(6) Chamakne Wali Pochak, Ludhiana 1877.

(7) Das ahkam ki Tamsili hikayaton, Ludhiana, 1877.

(8) Dili Sakhawat Ludhiana 1877, Amritsar 1879.

((9) Ek Tamsil Ludhiana 1877.

(10) Ganchai Tamsil Ludhiana 1878.

(11) Husul i Jawahir Ludhiana 1878.

(12) Ifshai raz Ludhiana 1877.

(13) Khun se Kharida hua, Allahabad 1875.

(14) Mard i mausod, Ludhiana 1877.

(15) Qissa i Jai Singh (a Christian convert), Ludhiana, 1878.

(16) Raja aur Naucar ki tamsil, Ludhiana 1877.

(17) Rastabz hakim, Ludhiana 1877, Amritsar 1877-78.

(18) Suraj ki roshni bhitor aur to, Amritsar 1879.

(19) Tiladar Pagri, Ludhiana, 1877.

(20) Tin Jawahir ki Tamsil, Ludhiana, 1877, Amritsar 1878.

(21) Tuti tatti ki tamsil, Amritsar 1878.

(22) Wilayat Ali Shahid ka bayan, Amritsar 1877-78.

181 Tucker, Henry Carro,
Yasu masih ka ahwal, Ludhiana, 1877.

182 Ullmann, J.F. Rev.

(1) Gitmala, Ludhiana 1871.

(2) Gitwali, Allahabad 1876, Ludhiana 1877.

(3) Mizan al Din, Ludhiana 1870, 1874.

(4) Su'al ojawab aur git, Ludhiana 1868-74.

(5) Wuh abadi ahd, Allahabad 1874.

(6) Wuh umda qadim naql, Allahabad 1871, Ludhiana 1871, 73, 75.

183 Velentine, C.S. Dr.

(1) Dua aur qul ka Khazanah, Agra 1868.

(2) Hava ki Paidaish (Pneumatics and Chemistry), Agra 1867.

184 Walker, Dr.
Gothan Sitala ka tika (Vaccination), Agra 1853.

185 Walker, J.P., Dr.
Mubtadi ki Pahli Kitab, Agra 1854.

186 Wall, Joseph,
Ikhwan al Safa, Lucknow 1874-89.

187 Walsh J.J. Mrs.
Guldasta i Tiflan (II ed.) Allahabad 1867-71.

188 Warren, J. Rev.

(1) Dua tilim aur ayaton, Allahabad 1848.

(2) Rahi I Zindagi, Allahabad 1850-76.

(3) Sachchi danish, Allahabad 1848.

(4) Taswir i Zillat i gunah, Allahabad 1878.

189 Wheeler, J.T.
Tarikh i jalsah i qaisari, Lahore 1883.

190 Wherry, E.M. Rev.

(1) Aga aur naukar, Ludhiana 1872.

(2) Bigre hue larke ki hikayat, Ludhiana 1875.

(3) Do ghar ki Tamsil, Ludhiana 1872-73 and 1877.

(4) Chunghion ki Kikayat, Ludhiana 1876.

(5) Janam Kundli, Ludhiana 1876.

(6) Khat banam Javanan i Hind, Ludhiana 1870-72.

(7) Malikah ki hikayat, Ludhiana 1875.

(8) Masih ibn Allah, Ludhiana 1875.

(9) Murghi ki hikayat, Ludhiana 1875.

(10) Paigham i Allah, Ludhiana 1875.

(11) Phulon ka har (Christian Doctrine), Ludhiana, 1876.

(12) Rassi ki Tamsil, Ludhiana 1872-73 and 1877.

(13) Shahzadah ki hikayat, Ludhiana 1876.

(14) Silk ki gauhar, Ludhiana 1870.

(15) Taj ki tamsil, Ludhiana 1871-73, 75, 77.

(16) Taskira i aurat, Ludhiana 1876.

191 Wilkinson, W., Rev.
Ilm i Jughrafia, Aligrah 1869-71.

192 Williams, H.R.
Fitrat i insani, Allahabad 1893.

Tahqiq al din al qaum, Allahabad 1892.

(Revised ed. of the book mentioned below)

Tahiq al jasa al ukhrawi, Agra 1873-74.

193 Williams, T. Rev.
Muhammad ki tawarikh ka ijmal, Ludhiana 1891 (comparison of the life of Mohd with Christ).

194 Wilson John Rev.

(1) Fuftugu fidin al islam, 3rd ed. Madras 1843.

(2) Musalmani din ka raddiya Bombay 1834.

195 Wilson, P.T. Rev.

Nur i hidyat II ed., Lucknow 1873.

196 Wood Henry,

(1) Hall i Suat i hisab, Lahore 1874.

(2) Kitab i hisab ka hall, Lahore 1877.

197 Wynyard, W.

(1) Dastur al amal aminan, Lahore 1850.

(2) Directions to settlement offices, Lahore 1850.

(3) Hidayatanmah i Peshkaran i Partal, Lahore 1850.

(4) Hidyatnamah i tahsildar, Lahore 1850.

(5) Namunah i Kaifiat i Haisiyat i dehi, Lahore 1850.

(6) Rules for the preparation of Survey Maps, Lahore 1850.